Vol.5 No.2 2022

ISSN Online: 2709-7625

ISSN Print: 2709-7617

پاکستانی دیہی تہذیب و معاشرت (1947-1960)

Pakistani Rural Culture and Society 1947-1960

* ڈاکٹر طارق مجید

اسسٹنٹ پروفیسر (اردو) گورنمنٹ اسلامیہ گریجویٹ کالج چنیوٹ

Abstract:
It is a fact that civilizations evolved near the natural resource e.g. the rivers or near to the food gaining arenas. Thus the groups of people settled there, they flourished and the populations started to grow. The various groups had different bonds among them; these ties and bonds for dealing others became the modes of behaviour which latter called the customs of that particular group and areas. The characteristics of that early civilizations were agrarian and rural. These characteristics were in practice and they were to be taught to the next generation. This teaching was very often practical but there were many things which were to be communicated through linguistic way and artistic methods. The collection of these collection latter named as 'Literature'. Consequently, our literature depicts the roots of our rural features. In this article, it is reviewed that how the literate (Novels) impact on the literature of Pakistan. Thus the period selected for this purpose stars from1947 to 1960. This is the formative period of the coming literature. here the impacted of rural literature has been surveyed here.

Key words: *Civilizations, Culture, Customs, Communication*

ہم بنی نوع انسان کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ کوئی شخص بھی اکیلا زندگی نہیں گزار سکتا۔ دشمنوں سے خود کو محفوظ رکھنے اور زندگی کی خوشیوں میں شریک ہونے کے لیے دوسروں کے تعاون کی ضرورت پڑتی ہے۔ وحشی سے وحشی انسانوں میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کا اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔ فصل کاٹنے یا بونے کے لیے دوسرے شخص کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی جذبہ سے معاشرتی اتحاد پیدا ہوتا ہے۔ یہی معاشرتی اتحاد تہذیبی اتحاد پیدا کرتا ہے جو لوگ زراعت کے پیشے سے منسلک ہیں انہوں نے اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے گاؤں میں بستیاں بسائی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک شخص کو زندہ رہنے کے لیے خوراک، لباس اور مکان کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اکیلا یہ چیزیں نہیں بنا سکتا۔ خوراک کے معاملے میں وہ سبزی والے کا محتاج ہوتا ہے اور یہ چیزیں بنانے والے اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کسی اور کے محتاج ہوتے ہیں۔ اسی طرح دیہات میں لوہار، ترکھان، موچی اور جولاہے وغیرہ کے پیشے بن گئے اور ان لوگوں نے گاؤں میں اپنی ایک بستی آباد کر لی۔ خانہ بدوش ایک جگہ سے دوسری جگہ اپنی ضروریات کے لیے نقل و حرکت کرنے لگے۔ ان لوگوں کی ایک گاؤں میں ثقافت دوسروں کے لیے اجنبی نہیں رہتی بلکہ ان کے مزاج کی ہم آہنگی عادات و اطوار، لباس کھانے پینے کے طریقے، اٹھنے بیٹھنے، رسم و رواج اور عقائد و زبان کی یکسانیت کی وجہ سے یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ وہ معاشرے میں سکون اور باہمی ہمدردی کے تحت زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

زندہ رہنے کی ضرورتوں نے انسان کے اندر ایک دوسرے کے ساتھ رہنے، ایک دوسرے کی مدد کرنے اور دوسروں کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کر کے اپنے طرز عمل کو دوسروں کے قریب ترلانے کی خواہش کو جنم دیا انسانی فکر کا بنیادی عمل اتحاد کی خواہش ہے اس اتحاد کی خواہش سے انسانی زندگی میں سرگرمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے ساتھ رہنے کی خواہش اور ایک دوسرے کی محتاجی کے بغیر کوئی معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا۔ معاشرتی زندگی کا یہ بنیادی عمل ہے۔ سیاسی و معاشرتی اتحاد بھی اس عمل سے جنم لیتا ہے اور ان سب کے امتزاج سے تہذیبی عمل اپنے نقوش ابھارتا ہے۔ اس خواہش کے زیر اثر طرز فکر و عمل کا اشتراک پیدا ہوتا ہے اور اسی طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس معاشرے کے افراد اپنے طرزِ عمل میں مشترک ہو جاتے ہیں۔ ان کے رسوم و رواج خوشی و غم کے طریقے، لباس، کھانے پینے نشست و برخاست وغیرہ سب میں اشتراک پیدا ہو جاتا ہے اور وہ ایک مکمل معاشرے کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

" (1) فکر و عمل کا یہی روحانی رشتہ جو مشترک روایات کی بنیادوں پر مشترک طرزِ زندگی کا موجب بنتا ہے۔ اس معاشرے کا کلچر کہلاتا ہے"

انگریزی زبان میں تہذیب کے لیے "کلچر" کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے جبکہ اردو فارسی اور عربی زبان میں کلچر کے لیے تہذیب کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ کلچر یا تہذیب کی تعریف کرتے ہوئے سبط حسن اپنی کتاب "پاکستانی تہذیب کا ارتقاء" میں یوں بیان کرتے ہیں۔

"کسی معاشرے کی بامقصد تخلیقات اور سماجی اقدار کے نظام کو تہذیب کہتے ہیں۔ تہذیب معاشرے کی طرزِ زندگی اور طرزِ فکر و احساس کا جوہر ہوتی ہے۔ چنانچہ زبان، آلات و اوزار پیدا کرنے کے طریقے اور سماجی رشتے، رہن سہن، فنون لطیفہ، علم و ادب، فلسفہ و حکمت، عقائد و افسوں، اخلاق و عادات، رسوم و روایات، عشق و محبت کے سلوک اور خاندانی تعلقات وغیرہ تہذیب کے مختلف مظاہر ہیں۔ انگریزی زبان میں تہذیب کے لیے کلچر کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ کلچر لاطینی زبان کا لفظ ہے اس کے لغوی معنی ہیں "زراعت، شہد کی مکھیوں، ریشم کے کیڑوں، سیپیوں یا بیکٹریا کی پرورش یا افزائش کرنا جسمانی یا ذہنی اصلاح و ترقی کھیتی باڑی کرنا" اردو فارسی اور عربی میں کلچر کے لیے تہذیب کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ تہذیب عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں کسی درخت یا پودے کو کاٹنا، چھانٹنا، تراشنا تاکہ اس میں نئی شاخیں نکلیں اور کونپلیں پھوٹیں فارسی میں تہذیب ایک معنی "آراستن پیراستن" پاک و درست کردن و اصلاح نمودن ہیں۔ اردو میں تہذیب کا لفظ عام طور پر شائستگی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص بڑا مہذب ہے تو اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ شخص مذکورہ کے بات چیت کرنے، اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کا انداز روایتی معیار کے مطابق ہے۔ وہ ہمارے آداب مجلس کو بڑی خوبی سے برتتا ہے۔ اور شعر و شاعری یا فنون لطیفہ کا ستھرا ذوق رکھتا ہے۔" (2)

گویا تہذیب میں کسی علاقے کے باشندوں کے عادت و اطوار، ہن سہن طرز زیست فنون لطیفہ، زبان پیداوار کے ذرائع، فلسفہ و حکمت یعنی کہ اس علاقے کی تمام سماجی اقدار شامل ہوتی ہیں۔ گویا کہ تہذیب انسانی سماج میں روابط کی جنکشن یا مجموعہ ہوتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا صاحب اپنی کتاب "تنقید اور احتساب" میں تہذیب (کلچر) کے بارے میں یوں فرماتے ہیں کہ

" کلچر کا لغوی مفہوم ہی کھیتی باڑی ہے

To Culture

کا مطلب زمین کو فصل کیلیئے تیار کرنا اس میں ہل چلانا، جھاڑ جھنکار سے اسے صاف کرنا اور اس میں کھاد ڈال کر زرخیز بنانا تاکہ اس میں اگلنے والی فصل توانا ہو۔۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ کلچر کا مفہوم محض زمین کی تیاری نہیں، زمین تو کلچر کا صرف کثیف حصہ ہے اگرچہ اس کثیف حصے کی اہمیت اتنی زیادہ نہیں ہے کہ اگر اسے خارج کر دیا جائے تو کلچر کا نام و نشان ہی باقی نہ رہے۔ دوسرا حصہ کلچر کی پاکیزگی اور ارفع صورت میں سامنے آتا ہے۔ عام طور سے لوگ کلچر سے مراد تو اسی کا ارفع پہلو لیتے ہیں یا کثیف پہلو، مگر دونوں صورتوں میں کلچر کا اصل مفہوم اور مزاج اجاگر نہیں ہوتا، میرے ذہن میں کلچر کی علامت وہ سرسبز شاداب پیڑ ہے جو اپنی غذا زمین اور کھاد ایسی کثیف اشیاء سے حاصل کرتا ہے لیکن جس سے یہی کثیف اور بدبودار عناصر ایک خاص کیمیائی عمل سے گزر کر پھول ایسی نازک اور معطر شئے میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ سارے کا سارا پیڑ اپنی غلیظ خوراک اور زمین سے چمٹی ہوئی جڑوں سے لے کر رنگین اور عطربیز پھولوں تک...... کلچر کی علامت ہے"۔ (3)

مختلف لغات میں تہذیب اور ثقافت کی تعریف مختلف طرح سے کی گئی ہے، جیسے کہ:

"تہذیب عربی کا اسم ہے اور مؤنث استعمال ہوتا ہے اس کے معنی شائستگی اور خوش اخلاقی ہیں" (4)

"ثقافت بھی عربی اسم ہے اور مؤنث استعمال ہوتا ہے اس کے معنی تہذیب...... کلچر ہیں۔" (5)

فرہنگ عامرہ میں محمد عبداللہ خویشگی تہذیب اور ثقافت کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں:

"تہذیب کے معنی پاک کرنا، اصلاح کرنا۔" (6)

اور

"ثقافت سے مراد تہذیب و تمدن کا اجتماعی ارتقاء تعلیم اور تربیت کے ذریعے انسان کے قوائے دماغ کی پرورش اور نشوونما، فرہنگ، کلچر ہیں۔"(7)

ثقافت (Culture) عربی لفظ، جس سے مراد کسی قوم یا طبقے کی تہذیب ہے علماء نے اس کی یہ تعریف مقرر کی ہے۔ "ثقافت اکتسابی یا ارادی یا شعوری طرز عمل کا نام ہے اکتسابی طرز عمل میں ہماری وہ تمام عادات، افعال، خیالات، رسوم اور اقدار شامل ہیں جن کو ہم ایک منظم معاشرے یا خاندان کے رکن کی حیثیت سے عزیز رکھتے ہیں یا ان پر عمل کرتے ہیں یا ان پر عمل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں" تاہم ثقافت یا کلچر کی کوئی جامع ومانع تعریف آج تک نہیں ہو سکی"۔(8)

Culture”

ثقافت، تہذیب، کلچر کاشت، گروہ یا فرد کی اکتسابی اہلیت یا قابلیت جس کے ذریعے وہ عام طور پر مسلمہ جمالیاتی اور ذہنی ذوق کی شناخت اور تحسین کر سکتا ہے تہذیب کا جمالیاتی اور ذہنی حاصل، کسی قوم یا عہد کے حوالے سے تہذیب کا ایک خاص ارتقائی درجہ یا حالت جسے

Chines Culture

(ثقافتی، بشریات، عمرانیات) انسانی چلن یا بیوپار کے نمونوں اور ٹیکنالوجی کا مجموعہ جو ایک سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا ہے (زراعت) زمین کو جوتنے یا کاشت کرنے کا عمل یا مہارت، کاشت، پودوں یا مویشیوں کی پرورش، بالخصوص انہیں ترقی دینے کے مقصد سے، پرورش جراثیم، ترقی، فصل جراثیم، زرع، کاشت کاری، تربیت، تہذیب اخلاق، پرورش، کشت (فعل متعدی) کاشت کرنا۔ سنوارنا۔ (حیاتیات۔ طب) مصنوعی طریقہ سے جراثیم کی پرورش کرنا متمدن بنانا۔“(9)

" کلچر۔ ا۔ کسی گروہ کے عادات واخلاق، عقائد، علوم وفنون اور اس کے رہن سہن کے طور طریقوں اور رسم ورواج، ثقافت، تہذیب وتمدن۔ ۲۔ تجربہ اور امتحان کی غرض سے شہد کی مکھی، مچھلی یا بیکٹریا وغیرہ کی پرورش کا عمل۔“(10)

CULTURE is a term used by social scientists and humanistic scholars that also has wide popular currency Nontechnical meanings of the term center Around the concept of an educated, sophisticated person as a "cultured" individual: that is, a man who has culture and polish and is familiar with the finer things produced in civilized life..... By 1910. Amercan anthropologists were using "culture" to refer to distinctive groups of traits characterizing particular tribal societies. In the 1930,s Ruth Benedict discussed culture as a pattern of thinking and doing that runs througe the activities of a pepole and distinguishes them from allother peoples. In later years, culture became a term used to describe the distinctive human mode of adapting to the environment-molding nature to conform the man,s desires and goals. However, all anthropologists agree that culture consists of the learned ways of behaving and adapting, s contrasted to inherited behavior patterns or instincts." (11)

CULTURE:1-(a) refined understanding and appreciation of art, literatre, ets: a society without much culture.

(b) (often derog) art, literature, etc collectively: tourists coming to Venice in search of culture.

2-State of intellectual development of a so ciety.

3- Customs, arts social institutions, etc.

4- Development through training, exercise, treatments, ets.

5- Growing of plants or rearing of certain type of animal(eg bees, silk worms, etc)

to obtain a crop or improve the species. (12)

تہذیب اور ثقافت کے درج بالا مفاہیم سے اس بات کا بخوبی پتہ چلتا ہے کہ لفظ تہذیب کا زور خارجی چیزوں اور طرز عمل کے اس اظہار پر ہے جس میں خوش اخلاقی، اطوار، گفتار و کردار شامل ہیں اور لفظ ثقافت کا زور ذہنی صفات پر ہے۔ جن میں علوم و فنون میں مہارت حاصل کرنا اور ترقی دینے کی صفات شامل ہیں۔ تہذیب و ثقافت کو اکٹھا کر کے ان کے لیے انگریزی کا ایک لفظ کلچر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کلچر لفظ زندگی کی ساری سرگرمیوں کا احاطہ کرتا ہے خواہ وہ سرگرمیاں ذہنی ہوں یا مادی، خارجی ہوں یا داخلی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کلچر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کلچر کسی قوم یا معاشرے کی وہ مشترک خصوصیت ہے جس سے نہ صرف ہم اسے پہچانتے ہیں بلکہ دوسرے معاشروں اور قوموں سے ممیز کرتے ہیں۔ کلچر کی اقدار بحیثیت مجموعی اپنے عاملوں کو ذاتی مفاد سے بلند تر کر دیتی ہے اور وہ ان اقدار، دلچسپیوں اور مقاصد میں اس درجہ محو ہو جاتے ہیں کہ ذاتی مفاد، حصول زر و جاہ جیسی چیزوں کو بے مایہ سمجھ کر حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ صدیوں سے افریقہ کے جنگلوں میں بسنے والے قبیلوں کی زندگی کا بنیادی مقصد یہ رہا ہے کہ وہ قدرت اور دشمن کے مقابلے میں اپنی حفاظت کس طرح کریں اور کس طرح اپنا پیٹ پالیں۔ ان مقاصد کے لیے تیر و کمان اور نیزے ایجاد کیے اور جب ان نیزوں اور کمانوں کو کھیل تماشے کے طور پر استعمال کیا گیا تو ان کی زندگی میں نئی خوشیوں کا اضافہ ہو گیا۔ یہ ابتدائی معنی میں ان کی تہذیبی سطح تھی۔ اس طرح پر انہوں نے مشترک طرزِ فکر و عمل اور خوشیوں کو جنم دیا اور نئے حوصلوں کے ساتھ ایک دوسرے میں گھل مِل گئے۔"(13)

کلچر کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں کہ

"دراصل کلچر ایک ایسا دریا ہے جو سدا اپنے منبع سے سمندر کی طرف بہتا رہتا ہے۔ ہم جس مقام پر بھی اس کے پانی کو چکھیں۔ وہ اپنے منبع سے اس مقام تک کے جملہ ذائقوں کے امتزاج کو ضرور پیش کرے گا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا کہ کلچر ایک پیڑ کی مانند ہے۔ ضرور ہے کہ جب ہم اس کے پھولوں کو چھوئیں گے تو دراصل اس کی جڑوں کو چُھو رہے ہوں گے۔ اس سے مفر نہیں۔"(14)

لفظ کلچر کی وضاحت محققین، ناقدین اور مصنفین نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے کی ہے کچھ لوگ کلچر سے مراد کھیتی باڑی، زراعت، مویشیوں کو استعمال میں لانے کے طریقے اور دیہاتی امور میں مویشیوں اور اجناس کی اہمیت لیتے ہیں۔ چند ناقدین اور مصنفین کلچر سے مراد دیہاتی لوگوں کے رہن سہن، ان کے آلات پیداوار، ان کے میل جول کے طریقوں، ان کی خوشی غم کی رسومات لیتے ہیں۔ بعض محققین کلچر کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ انسانوں کے مل جل کر رہنے سے جو معاشرہ پروان چڑھتا ہے اسے کلچر کہتے ہیں کیونکہ ہر علاقے کے لوگوں کا کلچر (رہن سہن) دوسرے علاقوں سے قدرے مختلف ہوتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کلچر کو یوں بیان کرتے ہیں:

"کلچر کوئی جادو یا ٹونا نہیں ہے۔ یہ تو مختلف عوامل کے باہمی ربط اور داخلی وحدت کا منطقی نتیجہ ہے۔ اپنے حال اور ماضی کی تاریخ کی نئی تاویل اور نیا خون شامل کرنے کا مسئلہ ہے۔"(15)

اگر ہم معاشرے میں مشاہدہ کریں تو معلوم ہو گا کہ جس معاشرے میں کلچر کے اجزائے ترکیبی یعنی کثیف عناصر موجود ہوں۔ وہ کچھ عرصے کے بعد ثقافتی اعتبار سے فعال ہو جاتا ہے اور اس کے فنون لطیفہ میں معاشرے کی وہ روح سمٹ آتی ہے۔ جسے اس معاشرے کے کلچر کا بہترین ثمر قرار دینا چاہیے۔ مثال کے طور پر جب ہم روٹی کے لقمے کو ریزہ ریزہ کرنے کے لیے چباتے ہیں تو اس عمل کو کوئی بھی پسندیدگی سے نہیں دیکھے گا لیکن جب یہی "ناپسندیدہ" ذراعت مختلف آنتوں سے گزر کر صاف خون میں تبدیل ہو جاتے ہیں تو ہر شخص خوشی سے اس کا جائزہ لے سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کو قائم رکھنے کے لیے غلاظت سے رفعت کا سارا عمل ضروری ہے۔ یہی مثال کلچر کی ہے کہ وہ زمین سے اپنی ابتداء کرتا ہے اور معاشرے کے ایک خاص نفسیاتی عمل سے گزر کر فنون لطیفہ میں ڈھل جاتا ہے اور ہم کلچر کے ثمر سے آشنا ہو جاتے ہیں تہذیب کی تشکیل و تعمیر میں طبعی حالات کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ ہر تہذیب کا اپنا ایک مخصوص جغرافیہ ہوتا ہے۔ اس کے دریا اور پہاڑ، جنگل اور میدان، پھل پھول اور سبزیاں، آب و ہوا، چرند پرند وغیرہ یعنی اس کا خارجی ماحول اس کے طرزِ عمل، ذریعۂ معاش، رہن سہن، خوراک و پوشاک جذبات و احساسات، اخلاق و عادات، مزاج و مذاق غرض یہ ہے کہ اس علاقے کے انسان کی زندگی کے ہر پہلو پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سمندر یا دریاؤں کے کنارے بسنے والوں کی تہذیب میں اور پہاڑوں کی تہذیب میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے یا ریگستانی علاقوں اور برف پوش میدان کی تہذیب میں بہت فرق ہو گا۔ ہماری تہذیب عربوں سے مختلف ہے تہذیبوں میں اختلاف کی ایک اہم وجہ طبعی حالات کا فرق ہے۔

پاکستانی معاشرے میں وادیٔ سندھ کی تہذیب میں عربی تہذیب کے شواہد آج بھی صاف نظر آتے ہیں ہڑپہ اور موہنجوداڑو دور کی ملنے والی تختیوں پر جس قسم کے بیل گاڑی یا جانوروں کی شکلیں بنائی گئی ہیں اس قسم کی بیل گاڑیاں آج بھی سندھ اور پنجاب کے دیہاتی علاقوں میں بآسانی دیکھی جا سکتی ہیں۔ اسی قسم کے لباس اور وضع قطع کے لوگ آج بھی ہماری سندھی تہذیب میں نظر آتے ہیں۔ حالانکہ عربی اور سندھی تہذیب میں خاصا فرق ہے لیکن پھر بھی سندھی تہذیب پر عربی تہذیب کے نقوش بہت گہرے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جیسے جیسے جانور پالنے، غلہ اُگانے اور کاشت کاری کے کام میں استعداد بڑھتی گئی ویسے ہی کلچر بھی ترقی کی طرف بڑھتا اور اپنے آپ کو نئے انداز میں بدلتا رہا۔ آب پاشی کاشتکاری کھاد اور مفید جانوروں کو پالنے کے ذریعے ایک طرف انسانی توانائی میں اضافہ ہوا۔ دوسری طرف اس کی محبت میں کمی ہوتی گئی اور ساتھ اس کے حاصل میں اضافہ ہوتا گیا اور ترقی کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ بیلوں سے ہل چلانے کنوؤں سے پانی نکالنے اور بار برداری کا کام لیا جانے لگا۔ اس عمل نے انسان کے طرز عمل کو متاثر کیا۔ نئے نظام معاشرت کو جنم دیا اور اس کی فکر کے بنیادی عوامل کو بدل ڈالا۔ زرعی ترقی کے ساتھ ہی انسانی معاشرہ اس کا ڈھانچہ بدلنے لگا۔ چھوٹے چھوٹے قبیلے ایک دوسرے میں جذب ہو کر

قوموں کی شکل اختیار کرنے لگے۔ آسمان سے باتیں کرتی ہوئیں عمارتیں تعمیر ہونے لگیں۔ دریاؤں کو اپنے استعمال میں لایا جانے لگا۔ جانوروں سے ڈرنے کی بجائے انہیں اپنا غلام اور مطیع بنالیا جانے لگا۔ کھانے پینے، برتن سازی وغیرہ میں تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ یہی تبدیلیاں کلچر کے نئے ڈھانچہ کے طور پر کام آئیں اور ہر طرف روحانی و اخلاقی مادی و ذہنی تبدیلیاں واضح نظر آنے لگیں۔ انسان نے بدلتے ہوئے دور میں زیادہ خوراک پیدا اور ذخیرہ کرنا شروع کیا۔ قحط اور خوراک کی کمی جیسے سنگین مسائل اور مشکلات پر قابو پانے لگا۔ غذا کی فراوانی کے ساتھ ساتھ آبادی میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ معاشرہ مختلف پیشوں میں بٹ گیا اور ایک گروہ دوسرے گروہ کی ضروریات پوری کرنے لگا۔ ہر گروہ دوسرے گروہ کی احتیاط پوری کرنے لگے اپنا معاوضہ لینے لگا اور اس طرح معاشرے میں زرعی اور صنعتی انقلاب کی طرف پیش قدمی ہونے لگی یعنی معاشرہ صلاحیتوں اور پیشوں کے اعتبار سے طبقوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک طرف معاشرتی اور تہذیبی ترقی کا راستہ کُھل گیا اور دوسری طرف تہذیبی ترقی آسمان پر اڑنے لگی۔

ڈاکٹر وزیر آغا اپنی کتاب "تنقید اور احتساب" میں لکھتے ہیں کہ

"کسی معاشرے کے کلچر کو سمجھنے کے لیے چند ثقافتی تقاریب میں شرکت کر لینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس کے لیے تو کلچر کے کثیف اور ارفع دونوں رخوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے یعنی یہ دیکھا جائے کہ کسی معاشرے کے کلچر کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔ نیز یہ تمام اجزاء کسی عمل سے گزر کر اپنی تکمیل کو پہنچتے ہیں۔ میرے نزدیک کلچر کے کثیف عناصر معاشرے کی خارجی سطح یعنی اس کے چھلکے پر مشتمل ہوتے ہیں اور ان میں طرز و بود و باش، رسوم، خوشی اور غم کی تقاریب، موسم کے ساتھ ہم آہنگی کے مواقع یعنی تہوار کا روباری زبان، کامرانی یا ردبلا کے لیے اقدامات، اردگرد کے ماحول سے اخذ و اکتساب کا رجحان اور اس قسم کی لاتعداد دوسری "صفات" شامل ہیں۔ بحیثیت مجموعی ان "صفات" کی حیثیت اس زمین کی سی ہے جس سے معاشرے کا پیڑ توانائی کشید کرتا ہے۔ ان تمام عناصر کو بجنسہ پیش کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم نے کسی کلچر کا مرقع پیش کر دیا۔ کیونکہ فی الحقیقت یہ تمام عناصر تو محض وہ "کچا مواد" ہے جو کلچر کی تعمیر میں صرف ہوتا ہے۔"(16)

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ پاکستان میں انسان تقریباً چار، پانچ لاکھ برس سے آباد ہے۔ جس مین انساں پتھر کی تہذیب، کانسی کی تہذیب اور لوہے کی تہذیب کے طویل دور سے ہو کر آیا ہے۔ اس دوران میں دراوڑ، آریہ، ساکا، ایرانی، یونانی، کشن، ہُن، عرب، ترک، افغان اور مغل وغیرہ قوموں کے لوگ مختلف عہد میں یہاں آکر آباد ہوتے رہے کیونکہ ان قوموں کے آثار آج بھی موہنجوڈرو، ہڑپہ، ٹیکسلا، پشاور، اوچھ، ملتان، لاہور، ٹھٹھہ اور چنیوٹ وغیرہ میں ملتے ہیں۔ اغلب گمان ہے کہ پاکستان کی تہذیب کا خمیر انہیں پرانی تہذیبوں کے قوام سے اُٹھا ہے۔ اب جہاں تک پاکستانی تہذیب کا تعلق ہے اس سلسلہ میں دانشور دو حلقوں میں منقسم ہو گئے ہیں جن میں دانشوروں کے ایک حلقے کا خیال ہے کہ پاکستانی تہذیب میں یک جہتی اور وحدت پائی جاتی ہے چونکہ پاکستان کے حصول کی جدوجہد اسلام کے نام پر کی گئی تھی اس لیے پاکستانی تہذیب کی بنیاد اسلامی تہذیب ہی ہونی چاہیے۔ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی صاحب اپنی کتاب "تہذیب و تخلیق" میں لکھتے ہیں کہ

"پاکستانی تہذیب، پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے موجود تھی اور پاکستان محض اس روح کو جسم دینے کے لیے وجود میں آیا۔"(17)

ڈاکٹر سجاد باقر رضوی ایک اور جگہ پر یوں رقمطراز ہیں:

"پہلی قسم کے دانشوروں کے نظریۂ تہذیب کو ہم آسانی نظریہ تہذیب کہہ سکتے ہیں اور جو لوگ اس نظریے کو مانتے ہیں وہ تہذیب میں زمینی عناصر کے قائل نہیں ہیں۔ وہ ایک پوری ملت اسلامیہ کے قائل ہیں اور زمین کے ساتھ رشتہ جوڑنے کو ملی مفاد کے خلاف جانتے ہیں۔ وہ جو تہذیب کے معاملے میں صرف اسلامی یعنی تنظیمی و پدری اصول کے قائل ہیں۔ اسلام کا یہ اصول مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک کے ممالک میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں زمینی یعنی تخلیقی و مادری اصول کے رابطے سے

وہاں کی تہذیبی زندگی میں جاری ہے۔ ”(18)

دوسرے حلقے کے دانشوروں کا خیال یہ ہے کہ کسی بھی خطہ زمیں کے لوگوں کے طرز زندگی میں خطے کی تہذیبی، تاریخی اور طبعی حالات کو بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ اس لیے تمام اسلامی ممالک کی تہذیبوں میں جہاں مذہب کی رو سے مماثلتیں پائی جاتی ہیں وہاں ان اسلامی ممالک کے مخصوص طبعی حالات کی وجہ سے ان کی تہذیبوں میں اختلاف بھی موجود ہیں۔

سلیم احمد پاکستانی تہذیب کو مذہبی قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک قیام پاکستان کا مقصد ہی اسلامی تہذیب کی بقا اور استحکام کا فریضہ انجام دینا تھا۔

"جب ہم یہ کہتے ہیں کہ پاکستان کی تہذیب اسلامی تہذیب ہے تو اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ خدا، فطرت انسانی اور نفس کے بارے میں ایک خاص طرح محسوس کرتی ہے۔ اور اپنی ہیت کے تمام مظاہر میں ایک بنیادی طرز احساس کا اظہار کرتی ہے۔ اس طرزِ احساس کے بغیر یہ تہذیب نہ اپنے اجزاء کو مجتمع کر سکتی ہے اور نہ ماضی، حال مستقبل کے تسلسل سمیں انہیں زندہ اور فعال طور پر قائم رہ سکتی ہے۔ ” (19)

احمد ندیم قاسمی پاکستانی تہذیب کو تہذیب کے اسلامی تصور سے وابستہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پاکستانی تہذیب کا عنوان یقیناً تہذیب کا اسلامی تصور ہی ہے۔ یہ حقیقت مفکرین اور دانشوروں کے ہر مکتب فکر کو قبول کر لینی چاہیے اور مزید کچھ مدت تک کسی خود فریبی میں مبتلا رہ کر پاکستان کی انفرادی تہذیب کے مسئلے کو ابہام کے سپرد نہیں کیے رہنا چاہیے۔ ”(20)

محمد حسن عسکری لکھتے ہیں:

"اگر اسلام انسانیت کی تاریخ میں ایک تہذیبی قوت بن کر آیا ہے تو ہم مسلمانوں کی تاریخ کو اسلام کے مفہوم سے خارج نہیں کر سکتے۔ اسلام کو ابدی حقیقت سمجھنے کے اور کوئی معنی نہیں ہیں اسلام اس لیے ابدی حقیقت ہے کہ وہ انسانی تاریخ کی رو سے الگ ہٹ کر کونے میں نہیں بیٹھ جاتا بلکہ تاریخ کی ہر نئی قوت کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ”(21)

جو لوگ پاکستانی تہذیب کی اساس اسلام پر رکھتے ہیں ان کے نزدیک پاکستانی تہذیب سے مراد اسلامی تہذیبی ہے اور یہ اسلامی تہذیب اس دن وجود میں آئی جب برصغیر پاک و ہند میں پہلے غیر مسلم نے اسلام قبول کیا۔ سبط حسن اسلامی تہذیب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

”"اسلامی تہذیب کے اس نظریئے کے مطابق زبانوں میں اردو، موسیقی میں قوالی، مصوری میں چغتائی آرٹ، شاعری میں فردوسی، اسلام میں حضرت حفیظ جالندھری کا کلام، ناول میں اسلامی تاریخی ناول، فلموں میں ابا حضور اور امی حضور کہنے والے رئیس زادے، فن تعمیر میں مغلیہ طرز کے گنبد و محراب، مردوں کے لباس میں جناح کیپ، شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ اور عورتوں کے لباس میں غرارہ اسلامی تہذیب کی علامتیں قرار دی گئیں۔ ”(22)

ڈاکٹر عارف ثاقب ثاحب پاکستانی تہذیب، اسلامی تہذیب، پاکستانی ادب اور اسلامی ادب کے سمندر کو کوزے میں بند کرتے ہوئے اپنے تحقیقی نقطۂ نظر کو یوں بیان کرتے ہیں۔

"قیام پاکستان کے عمل نے ادب کے مسائل اور قضیوں کی شکل ہی بدل کر رکھ دی۔ وہ معاملات اور مسائل جو پہلے ادب میں سرے سے موجود ہی نہ تھے اب آن موجود ہوئے۔ سوال یہ تھا کہ براعظیم کے جغرافیے کی تبدیلی اور تقسیم سے کیا ادب بھی تقسیم ہو گیا اور کلچر بھی تقسیم ہو گیا۔ اس تناظر میں پاکستانی تہذیب، اسلامی تہذیب اور پاکستانی ادب اور اسلامی ادب کی اصطلاحوں نے جنم لیا اور مباحث کے نئے در کھولے۔ ادیبوں اور دانشوروں کو ایک نیا موضوع ہاتھ آیا تو طویل مباحث کی صورت میں انداز فکر کے نئے زاویے سامنے آئے۔ ایک نیا طرز احساس ابھرا جس کی فکری احساس نظریات پر استوار تھی۔ بیسویں صدی کے عین وسط میں پیدا ہونے والے ان مباحث کا کوئی نتیجہ نکلا ہو یا نہ نکلا ہو لیکن یہ بات بہر طور ثابت ہو گئی کہ اردو ادب کو ایک ایسی منزل کی تلاش ضرور ہے جہاں وہ مغرب سے درآمدہ نظریات و افکار کے غیر ضروری بوجھ سے آزاد ہو کر خالص پاکستانیت کی نمائندگی کر سکے۔"(23)(

دوسرے حلقے کے دانشوروں کا نظریہ ہے کہ پاکستانی تہذیب میں وحدت نہیں پائی جاتی بلکہ جو تہذیبیں مختلف زمانوں اور زبانوں کے ساتھ اس خطے میں پھلتی پھولتی رہیں۔ پاکستانی تہذیب انہی تہذیبوں کا مرغوبہ ہے۔ پاکستان ہندوستان کا حصہ تھا اور ان میں ایک جیسی تہذیبیں ملتی تھیں اس لیے پاکستان کی تہذیب بہت پرانی ہے اور اس تہذیب کی جڑیں بہت دُور تک چلی جاتی ہیں۔ اگرچہ پاکستان 14 اگست 1947ء کو دنیا کے نقشے پر ابھرا لیکن اس کے تہذیبی عناصر و خدوخال پرانے ہیں اور سبط حسن اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ

"پاکستان کی تہذیب اتنی پرانی ہے جتنے یہاں کے باشندے۔" (24)

جو دانشور پاکستانی تہذیب اور تہذیبی وحدت کے وجود سے انکار کرتے ہیں۔ وہ پاکستان کو ایک ریاست تو تسلیم کرتے ہیں لیکن وہ پاکستان کو تہذیبی اکائی نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک پاکستانی تہذیب کوئی شئے نہیں ہے۔ البتہ پاکستان میں کئی علاقائی تہذیبیں ضرور موجد ہیں۔ ان تہذیبوں کی زبان، ادب، رسم و رواج تاریخی روایات، ناچ گانے، غم و خوشی کی رسوم اور سماجی قدریں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور یہ علاقے پاکستان قائم ہونے سے ہزاروں برس پہلے کے خطہ ارض پر آباد ہیں۔ وہ لوگ پاکستانی تہذیب کا وجود ہی نہیں مانتے وہ کہتے ہیں کہ:

"پنجابی، بنگالی، سندھی، پشتو اور بلوچی تہذیبیں تو ہو سکتی ہیں مگر پاکستانی تہذیب نہیں ہو سکتی۔"(25)

اس حلقہ خیال کے دانشور یہ باور کرانے پر مصر ہیں کہ پاکستانی ثقافت کا منع ہند اسلامی تہذیب و تمدن نہیں بلکہ اس کے لیے ہمیں قدیم تاریخ کے کالے کوسوں کا سفر طے کرنا ہو گا۔ قدیم تہذیبی آثار موہنجو داڑو، ہڑپہ اور ٹیکسلا کے کھنڈر کھودنے ہونگے جہاں سے زندہ پاکستان کی ثقافت کا ڈھانچہ برآمد ہو گا۔ یہی ڈھانچہ پاکستانی ثقافت کا پچھلا جنم ہے۔ جسے 14 اگست 1947ء کو پاکستان کی شکل میں نیا وجود ملا۔ اگر بنظر تعمق دیکھا جائے تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ پاکستانی تہذیب و ثقافت اور معاشرتی رسوم و قیود مزاجاً زرعی ہیں۔ آج بھی پاکستانی شہروں اور قصبوں کے نظام ہائے کار پرانی وضع کے دیہاتوں سے ملتے جلتے ہیں۔ زرعی فصلوں (گندم، جو، مکئی، گنا، چاول وغیرہ) کو اُگانے اور انہیں محفوظ کرنے کے طریقہ کار بھی تقریباً وہی ہیں۔ اس ارض پاک کے پرانے باشندے کھیتی باڑی کرتے تھے اور اپنے ہل کو دو بیلوں کی مدد سے چلاتے تھے۔ آج بھی اس بل میں نہ ہی تبدیلی آئی ہے اور نہ ہی بیلوں کی تعداد میں کمی بیشی ہوئی ہے قدیم وادی سندھ میں آباد لوگوں کے بارے میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ وہ زراعت کے پیشے سے وابستہ تھے۔ ان کے ہاں مٹی کے برتن بنانے اور انہیں استعمال کرنے کا رجحان تھا۔ آج کل ہم پاکستانی شہروں اور دیہات میں بآسانی ایسے برتن (جو زیر استعمال ہیں) دیکھ سکتے ہیں اس زرعی معاشرے کے لیے جانوروں کا وجود ناگزیر تھا۔ ان میں خاص طور پر بیل، بھینس، اونٹ، گھوڑے اور بکریاں شامل تھیں۔ بیلوں سے وہ اپنی زمین میں ہل چلاتے اور زمین کو بوائی کے لیے تیار کرے۔ اونٹ گھوڑوں اور گدھوں سے سواری کا کام لیتے اور ان پر بوجھ لادتے۔ بھینسوں، گائیوں اور بھیڑ بکریوں کے دودھ سے اپنی خوراک کا کام لیتے۔

آج بھی پاکستانی معاشرے میں ان جانوروں سے بڑے اہم کام لیے جاتے ہیں۔ ہر زرعی معاشرے میں جانوروں کا بڑا اہم کردار رہا ہے۔ زرعی نوعیت کے رکھ رکھاؤ اور ان کے نقل و حمل سے معاشرے میں رہنے والے لوگوں کے حالات زندگی، اعتقادات اور معاشی و معاشرتی حالات کا بڑی آسانی سے پتہ چل سکتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی کتاب "تنقید اور احتساب" میں ان جانوروں کے معاشرتی زندگی پر ہونے والے اثرات کے بارے میں ایک مثال سے بات کو واضح کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ:

" جس کلچر میں اونٹ اور گھوڑے سے لگاؤ موجود ہو وہاں کے عوام میں بھی گھوڑے کی سی برق رفتاری اور اونٹ کی سی جانفشانی کے شواہد عام طور سے ملیں گے اس طرح بھیڑ بکری سے وابستگی خانہ بدوشی کے رجحان کو مہمیز لگائی ہے اور جو معاشرہ بھیڑ بکری سے وابستہ ہو، بالعموم خانہ بدوش اختیار کر لیتا ہے۔ بھینس سے وابستگی، غنودگی، ٹھہراؤ اور جسم کی سطح پر زندہ رہنے کے عمل کو مضبوط بناتی ہے بھینس کی سست رفتاری اور بے نیازی تو ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہے۔"(26)

پاکستانی کلچر کے بارے میں ماہرین کی تاریخ کے مطابق، اس تہذیب کا ارتقاء پانچ ہزار سال قبل مسیح میں ہوا، جب دراوڑوں نے وادیٔ سندھ کی تہذیبی بنیاد رکھی۔ اس کے بعد جو بھی تہذیبیں یہاں نمودار ہوئیں وہ تمام بیرونی حملہ آوروں کی لائی ہوئی تھیں پاکستانی معاشرے پر مختلف تہذیبوں نے اپنے اثرات بالکل واضح انداز میں مرتب کیے اگر ہم وادی سندھ کی تہذیب چھوڑ دیں تو ہمیں پاکستانی تہذیب کی بنیاد ملنا مشکل ہو جائے گی کیونکہ سبط حسن کے مطابق

"ہندوستانی تہذیب کو پسِ پشت ڈال کر پاکستانی تہذیب کا مطالعہ ممکن ہی نہیں۔"(27)

کیوں کہ پاکستانی تہذیب کا نقطۂ آغاز وادیٔ سندھ کی تہذیب ہے۔ یہ تہذیب تقریباً تین ہزار برس تک اس خطے میں پھلتی پھولتی رہی اور ہزار ہا برس پر پھیلے ہوئے عناصر کی آمیزش سے اس کا ایک خاص مزاج متعین ہو گیا۔ جب آریاؤں نے وادیٔ سندھ پر قبضہ کیا تو انہوں نے اپنے ساتھ لائی ہوئی تہذیب یہاں کے باشندوں میں عام کر دی لیکن ساتھ ہی اس علاقے کی تاریخی تہذیب کو ختم نہ ہونے دیا۔ آریاؤں نے اپنے فنون لطیفہ، مذہب، زبان اور ثقافتی اقدار کے ساتھ ساتھ اس وادی کی ثقافت کو بھی ترقی بخشی۔ بعد میں جب اس معاشرے پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تو وہ اپنی اسلامی، تہذیب و ثقافت کو ساتھ لے کر آئے اور اس وادیٔ سندھ کی تہذیب میں اسلامی ثقافت شامل ہونا شروع ہو گئی۔ آج بھی وادیٔ سندھ کی ثقافت کے آثار کے ساتھ آریاؤں اور اسلامی ثقافت کے نشانات دیکھے جا سکتے ہیں۔

کسی بھی خطے کی تہذیب و معاشرت کی حقیقی بنیادوں کا سراغ لگانے کے لیے ہمیں شہر کو چھوڑ کر دیہات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے کیونکہ کسی بھی تہذیب کے ابتدائی نقوش انہی علاقوں سے حاصل ہوتے ہیں ڈی ڈی کوسمبی جب ہندوستان کی تہذیب کا تاریخی نقطۂ نظر سے جائزہ لیتے ہیں تو وہ ہندوستان کی دیہی معاشرت کو شہری معاشرت پر ترجیح دیتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ہندوستانی تہذیب کا قوام دیہاتی معاشرت سے وجود میں آیا ہے۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ

" معاشرت کی مختلف تہوں میں قدیم اوضاع و اطوار کے ایسے باقیات موجود ہیں جن کی مدد سے قبل کے کلیتا متنوع معاشرتی مدارج کا خاکہ از سر نو مرتب کیا جا سکتا ہے۔ معاشرے کے ان قدیم و جدید مدارج طبقات کو پانے کے لیے شہروں کو چھوڑ کر دیہی علاقہ میں جانا ضروری ہے۔"(28)

بعض ماہرین ابتدائی اوزاروں کو بہت اہمیت دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ کسی بھی معاشرہ کی تہذیب و ثقافت، رہن سہن، رسوم و رواج، خوشی و غم کی محفلیں، دوستیوں و دشمنیوں اور ان کے عادات و اطوار پر اس وقت کے اوزار بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ انہی اوزاروں سے اس وقت کے معاشرے کے بارے میں کافی حد تک معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ پاکستان میں انسانی آبادی کے آثار حجری دور کے پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ان چھوٹے چھوٹے پتھروں کو وہ اوزار کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ جن سے وہ جانوروں کا شکار کیا کرتے تھے۔ ماہر آثار قدیمہ عبدالحمید دانی اپنی کتاب "تاریخ پاکستان" میں لکھتے ہیں کہ

" انسان اوزار ساز ہونے پر مجبور ہے۔ انہیں اوزاروں کی مدد سے اور ان کے ارتقا سے ہم زمانہ قبل از تاریخ کے انسان کا، اس کے خیالات اور اعمال کے ارتقاء کا، قدرت کے خلاف جدوجہد کا، اپنے لیے بہتر ماحول پیدا کرنے اور سہولتیں فراہم کرنے کا...... مختصر یہ کہ اس کی پوری تشکیل کا سراغ لگاتے ہیں چنانچہ قدیم انسان کے بارے میں معلومات کا بنیادی ذریعہ اوزار ہوتے ہیں۔“(29)

دیہی تہذیب طبعی حالات اور مٹی سے جنم لیتی ہے۔ یہ تہذیب شہروں کی نسبت بیرونی حملہ آوروں سے زیادہ محفوظ ہوتی ہے۔ اس لیے اس تہذیب میں دھرتی سے سچے جذبات کی بورچی بسی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس شہروں کی طرز زندگی پر صنعت وحرف اور تجارتی مراکز ہونے کی وجہ سے بیرونی تہذیبوں کے اثرات زیادہ ہوتے ہیں جس کی وجہ سے شہروں کی معاشرت میں مقامی تہذیب کے علاوہ بہت سی دوسری تہذیبوں کے عناصر بھی شامل ہوتے ہیں۔ اور ایک مخلوط معاشرت وجود میں آجاتی ہے۔ یہ مخلوط معاشرت آجکل ہر دوسرے ملک کی طرح پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اب پاکستانی تہذیب ایک نئے ارتقائی دور میں داخل ہو چکی ہے۔ یہ دور صنعتی تہذیب کا ہے۔ یہ دور برق رفتاری اور خودکار مشینوں کا دور ہے۔ اس صنعتی تہذیب کا اثر ہمارے دیہاتوں اور شہروں پر یکساں اثر پذیر ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ صنعتی تہذیب سے پیشتر کی تہذیبی چاہیے وہ موہنجوداڑو اور ٹیکسلا کی تہذیبیں ہوں یا عربی ترکوں ایرانیوں اور مغلوں کی تہذیبیں یا علاقائی تہذیبیں، سب کی سب زرعی تہذیبیں تھیں۔ ان کے فکر و فن اور اقدار حیات کا سارا نظام کھیتی باڑی سے وابستہ تھا۔ ان کے ناچ گانوں سے گیتوں، نظموں اور کہانیوں سے، موسمی تیوہاروں اور کھیلوں سے، ان کی گھریلو دستکاریوں سے، ان کی غم و خوشی کی رسوم ورواج سے ان کی فصلوں کی بوائی اور کٹائی سے دیہی زمین کی مہک آتی ہے۔ ان کی تخلیقی محرکات بازارنہ تھے۔ بلکہ فن کاروں کے جمالیاتی ذوق کے اظہار میں افادیت اور عقیدت کا جذبہ کارفرما ہوتا تھا ان کے اپنے خیالات اور حسی تجربات میں دوسروں کو شریک کرنے کی شدید خواہش ہوتی تھی۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے ایک مضمون ”ادب میں ارضیت کا عنصر“ میں شہر اور دیہات کے معاشرتی فرق کی وضاحت ایک مثال سے دی ہے وہ کہتے ہیں کہ کسی خطۂ ارض میں دیہات کی حیثیت عقبی دیار(hunter Land) کی سی ہوتی ہے جو نسل، جذبہ، خون اور زاویہ نگاہ کے عناصر سے ترکیب پاتا ہے جبکہ شہر کی حیثیت تماشا گاہ یعنی(Disney Land) کی سی ہوتی ہے جو اپنا خون دیہات سے حاصل کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی تہذیبوں سے بھی متاثر ہوتا ہے۔ اس طرح شہر ایک مخلوط تہذیب کو جنم دیتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کا رشتہ مقامی تہذیب کے ماخذ (دیہات) سے بھی منسلک ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق:

" جب تک کوئی شہر اپنے عقبی دیار سے وابستہ رہتا ہے۔ اس کے فنون لطیفہ کو فروغ اور اس کے تمدن کو عروج حاصل ہوتا ہے لیکن جب وہ اس عقبی دیار سے منقطع ہو کر محض ایک بین الاقوامی ڈزنی لینڈ میں بدل جاتا ہے تو اس کی خوشبو زائل ہونے لگتی ہے۔“(30)

ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی کتاب ”پاکستانی کلچر“ میں توانائی کی تسخیر و تصرف کے عمل کا معاشرے پر ہونے والے اثرات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

" گاؤں، دیہات کی زندگی میں توانائی کے تصرف کا عمل صدیوں سے وہی چلا آرہا ہے جو زرعی انقلاب کے بعد کئی صدیوں میں جا کر یہاں رائج ہوا تھا وہی ہل بیل ہیں جو چینی، مصر، میسوپوٹامیہ کے دور عروج میں نظر آتے ہیں۔ وہی مشاغل اور مصروفیات ہیں جو صدیوں سے چلی آرہی ہیں چونکہ ہمارے ہاں توانائی کی تسخیر و تصرف ضعیف ہے۔ اس لیے زندگی کی رفتار ترقی سست اور کلچر بھی ضعیف ہے۔ پہلے بھی جنگل کی گھاس اور لکڑیاں جلا کر روشنی حاصل کی جاتی تھی اور آج بھی گھاس، لکڑی اور اپلے گرمی اور روشنی بہم پہنچاتے ہیں۔ پہلے بھی بیل اور ہل کے ذریعے انسان اپنی توانائی میں اضافہ کرتا تھا آج بھی یہی عمل اس طرح ہمارے ہاں ہو رہا ہے۔ تیل کا چراغ آج بھی تہذیب کے مزار پر روشن ہے۔“(31)

رشید اختر ندوی نے اپنی کتاب ”ارض پاکستان کی تاریخ“ میں حوانیت تامہ سے زراعت کے زمانے تک لکھتے ہیں کہ

" آدمی نے جب ’حیوانیت تامہ‘ کے دور سے باہر قدم رکھے تو اسے زراعت کے زمانہ تک پہنچتے، ہزاروں سال لگ گئے تھے اور اس نے بہت آہستہ آہستہ یہ سفر طے کیا تھا۔ یہ سفر، زیادہ سے زیادہ بیس ہزار سال پہلے اور کم سے کم آٹھ ہزار سال قبل شروع ہوا تھا۔“(32)(

آج اگرچہ جدید مشینوں کے ذریعے کسانوں اور زمینداروں نے دیہات کے سماجی اور زرعی نظام کو کافی حد تک تبدیل کر دیا ہے لیکن آج سے چند سال قبل جب ہمارے ارض پاک میں صنعتی دور کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ اس زمانے کی دیہی معاشرت میں صدیوں پرانے تہذیبی عناصر کار فرماتھے۔ چالیس پچاس سال پہلے پاکستانی کسان جس قسم کے اوزار زمین کے لیے استعمال کرتا تھا وہ موہنجوداڑو، ہڑپہ اور ٹیکسلا سے ملنے والے قدیم اوزاروں سے ملتے جلتے ہیں۔ بر صغیر میں زمین کی تیاری کے ابتدائی مرحلہ میں ہل اور بیلوں سے کام لیا جاتا تھا۔ آج بھی پاکستان کے دیہاتوں میں بیلوں اور ہلوں کو بآسانی زیر استعمال دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ زرعی اجناس ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانے کے لیے بیل گاڑی کو گڈا، گڈو یا گڈ آج بھی پاکستانی دیہات میں زیر استعمال ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ زرعی اوزار دراوڑ باشندوں کی ترقی یافتہ شکل میں موجود ہیں پاک سرزمین کو قدرت نے بہت سی نعمتوں سے نوازا ہے جس میں آسمانوں سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑ ہیں جن کے دامن قیمتی معدنیات کی دولت سے مزین ہیں۔ سارا سال ملک کے زرعی علاقوں کو اپنے بازوؤں میں سمیٹنے والے وسیع و عریض دریا ہیں اس ملک میں صحر اور ریگستان بھی ہیں اور سنگلاخ وچٹیل میدان بھی، سونا اگلتی ہوئی زمینیں بھی ہیں اور چاندی بکھیرتی ہوئی فصلیں بھی۔ الغرض پاکستانی زمین زرخیزی میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ صوبہ پنجاب سارا اور صوبہ سندھ سرحد اور بلوچستان کے اکثر علاقے زرخیزی کی دولت سے مالا مال ہیں۔ پاکستان بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے اور اس کی آبادی کا ستر فیصد سے زیادہ حصہ زراعت سے منسلک ہے۔ زراعت کی حیثیت پاکستان کے جسم میں بطور ریڑھ کی ہڈی کی سی ہے۔ جغرافیہ کی رو سے دیہات اس علاقے یا آبادی کو کہنے میں جو آبادی اپنے کھیتوں کے ارد گرد پھیل جاتی ہے یا اپنی فصلوں کی حفاظت کے لیے قریب ہی گھروں کی شکل میں رہنے لگتی ہے۔ دیہاتی آبادکاری کا آغاز اس وقت شروع ہوا جب قبائلی لوگ زراعت کے فن سے آگاہ ہوئے کیونکہ زراعت کے ذریعے جو فصل بوئی جاتی تھی۔ اسے پک کر کٹائی کیلئے تیار ہونے میں چھ سے نو ماہ کا عرصہ درکار رہتا تھا۔ اس لیے ان قبائلی لوگوں نے اپنی فصلوں کی حفاظت کے لیے اپنی فصلوں کے ارد گرد چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بنانی شروع کر دیں اور آہستہ آہستہ ان جھونپڑیوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی اور ان جھونپڑیوں نے ایک ساکن معاشرے کو جنم دیا۔ زراعت کے اس ساکن معاشرے میں لوگوں نے اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مختلف ہنر اور پیشے اختیار کرنا شروع کر دیئے تاکہ ایک طرف اپنی ضروریات کو پورا کیا جاسکے اور دوسری طرف اپنی خدمات کا بہتر معاوضہ حاصل کیا جاسکے۔ اس طرح لوگوں کے درمیان معاشی، سماجی اور معاشرتی روابط قائم ہونے لگے۔ ان معاشرتی روابط نے ایک دیہی معاشرے کو جنم دیا۔ اس طرح دیہات بتدریج گاؤں، قصبات اور شہروں میں تبدیل ہوتے گئے اس لیے شہر کو دیہات کی ترقی یافتہ شکل کہا جاتا ہے۔ قصبات سے شہر اس وقت وجود میں آتے ہیں جب کوئی علاقہ تجارت یا صنعت و حرفت یا کسی اور وجہ سے دوسرے علاقوں کی توجہ کا مرکز بن جائے۔ اس طرح کاروبار وسیع ہو جاتا ہے۔ شہروں میں تجارت کے لیے بڑی بڑی منڈیاں وجود میں آجاتی ہیں جو لوگ شہروں میں کام کرتے ہیں۔ وہ اس تجارتی منڈیوں کے ار گرد گرد نئی بستیاں بسا لیتے ہیں جس سے شہر وجود میں آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ پاکستان ایک زرعی ملک ہے اور اس کی غالب آبادی دیہاتوں سے منسلک ہے اس بات کا اندازہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ پاکستان میں اضلاع شہری آبادیوں پر مشتمل ہیں اور جن کی تعداد ایک سو دس سے زائد ہے۔ اسی طرح پاکستانی تحصیلیں تقریباً قصبات پر مشتمل ہیں اور ان تحصیلوں کی تعداد تین سو چھتر ہے۔ یونین کونسلیں دیہاتوں پر مشتمل ہوتی ہیں اور ان کی تعداد چار ہزار ایک سو سنتالیس ہے۔ اس کے علاوہ ٹاؤن کمیٹیوں کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔ اس طرح یہ بات بالکل پائیہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ پاکستان ایک زرعی ملک ہے۔

شہروں کی تہذیبوں کا اثر دیہاتوں پر بھی پڑ رہا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے دیہی اور قصباتی علاقوں کی سماجی اقدار اور طرز زندگی میں بہت سی تبدیلیاں آچکی ہیں۔ ٹیلی مواصلات اور نقل و حمل کی بہتر سہولتوں کی وجہ سے شہروں اور دیہاتوں کا درمیانی فاصلہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ سائنس کی تری کی بدولت پوری دنیا ایک گلوبل ویلیج کی

صورت میں تبدیل ہو گئی ہے۔ اس تیز رفتار سائنسی ترقی کے باوجود پھر بھی دیہات میں روایتی سماجی اقدار اور رسوم وروایات کی پیروی کو لازمی سمجھا جاتا ہے کیونکہ اہل دیہات اپنے اباؤ اجداد کی بنائی ہوئی رسوم و قیود سے باہر نکلنا اپنے آباؤ اجداد کے طریقوں اور رسوم سے گستاخی اور مذاق سمجھتے ہیں۔ اس لیے آج اگرچہ دیہات کے اکثر گھروں میں ریڈیو، ٹی وی اور دیگر سہولتیں میسر ہیں لیکن پھر بھی سر گشتہ رسوم و قیود کے بڑی حد تک قائل اور ان پر عمل کرنے والے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا اس فرق کو واضح کرتے ہوئے اپنی کتاب دائرے اور لکیریں میں لکھتے ہیں کہ

" وقت کی مسلسل یلغار کے آگے مشکل ہی سے کوئی دیوار ٹھہر سکتی ہے۔ لہٰذا ہر گاؤں داخلی و خارجی دونوں اعتبار سے ایک مسلسل متغیر کی زد میں آکر تبدیل ہوتا رہتا ہے مگر تمام تبدیلیوں کے باوجود ہر گاؤں کے عقب میں ایک گاؤں بغیر کسی تبدیلی کے سدا موجود رہتا ہے۔"(33)

قیام پاکستان کے وقت دیہاتوں میں روایتی اور دیسی قسم کے طریقے سے فصلیں کاشت کی جائیں۔ انیس سو ساٹھ اور ستر کے درمیانی عرصہ میں زمینداروں نے مشینی کاشت شروع کی۔ جس سے اہل دیہات اور ان کی فصلوں پر بڑے خوشگوار اثرات مرتب ہوئے۔ پرانے زرعی نظام میں کاشتکاری بیل اور ہل سے کی جاتی تھی۔ چھوٹے سے قطعہ کھیت میں ہل چلانے کے لیے کافی وقت درکار ہوتا تھا۔ بیلوں کی جوڑی کو صبح سے لیکر شام تک کسان کے ساتھ کھیت میں کام کرنا پڑتا لیکن جدید طریقہ کاشتکاری میں مشینوں کی مدد سے تھوڑے عرسے میں زیادہ قطعہ زمین کو کاشت کے لیے تیار کر لیا جاتا ہے۔

زراعت میں "ہل اور بیل" کی قدر و قیمت دیگر چیزوں سے کئی گناہ زیادہ ہے۔ ہل بیل کے ذریعے کاشتکاری کا پیشہ ایک مخصوص زرعی نظام کی نشاندہی کرتا ہے اس نظام میں لوگ پیداواری عمل میں ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں۔ کاشتکار زراعت کے مختلف مراحل تن تنہا طے نہیں کر سکتا۔ کاشتکاری کے آلات مثلاً کھرپا، کسی، کدال، پھاوڑا، ہل، درانتی، سہاگا وغیرہ کے لیے وہ گاؤں کے بڑھئی اور لوہار سے مدد لیتا ہے، کمہار اس کو برتن بنا کر دیتا ہے، جولاہا کپڑے کا سامان، موچی چمڑے کا سامان اور تیلی تیل وغیرہ فراہم کرتے ہیں اور کاشتکار ان تمام خدمات کا معاوضہ فصل تیار ہونے پر اناج کی شکل میں ادا کر دیتا ہے۔ کھیتی باڑی کے کام میں بھی کاشتکار امداد باہمی کے اصول پر کام کرتے ہیں۔ عورتیں کھانا پکاتی ہیں، چکی پستی ہیں۔ مویشیوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں، کنوئیں سے پانی اور جنگل سے ایندھن لاتی ہیں اور گھر کے دوسرے کام کرتی ہیں۔ اس پیداواری عمل سے گاؤں کی ایک مخصوص تہذیب جنم لیتی ہے۔ دیہات میں مویشیوں کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے کیونکہ یہی جانور وان کے لیے نئ سے نئ فصل کاشت کرنے، فصل کاٹنے کے ساتھ ساتھ گوشت اور دودھ کے لیے بہت مفید ثابت ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے پاکستانی معاشرے میں گائے بھینس اور بکری کو بڑی محنت اور شوق سے پالا جاتا ہے۔

پرانے زرعی نظام میں کھیت بہت چھوٹے ہوتے تھے اور ان پر کام کرنے والے مزدور کافی وقت ایک ہی کھیت میں بوائی یا کٹائی پر صرف کر دیتے لیکن آج کل زیادہ بڑے کھیت کم آدمیوں اور مشین کی مدد سے جلدی کاشت کے قابل یا بوائی کے لیے تیار کر لیا جاتا ہے۔ جدید دور میں فارم کی نگرانی کسی ماہر زراعت کے سپرد کی جاتی ہے۔ جتائی بوائی کٹائی اور ذخیرہ اندوزی کے لیے مشینیں استعمال ہونے لگی ہیں۔ مثال کے طور پر دھان کی فصل سے چاول حاصل کرنے کے لیے بڑا عرصہ لگ جاتا تھا پہلے دھان کو کاٹ کر خشک کیا جاتا پھر خشک ہونے کے بعد زمین پر دھان کے خشک حصے مار مار کر ان سے چاول نکالے جاتے لیکن اب دھان کے صرف سٹے مشینوں کی مدد سے توڑ لیے جاتے ہیں اور جب یہ خشک ہو جاتے ہیں تو انہیں بڑی بڑی مشینوں سے گزار کر چاول دنوں میں ٹنوں کے حساب سے حاصل کیے جا رہے ہیں۔

پہلے وقتوں میں عورتیں گھریلو استعمال کے لیے پانی کئی کئی میل دور سے جا کر لاتی تھیں۔ آٹا حاصل کرنے کے لیے چکی پیستی تھیں لیکن آج کے اس دور میں عورتیں چکی نہیں پیستی اور نہ ہی دور دراز سے پانی بھرنے جاتی ہیں بلکہ گھر میں ہی پانی کے نل اور بجلی کے بلب لگے ہوئے ہیں پیسا ہوا آٹا آسانی سے بازار سے مل جاتا ہے۔ اب عورتیں ہاتھ سے

سینے پرونے کی بجائے سلائی کی مشینیں چلاتی ہیں بلکہ بازار سے بنے بنائے کپڑے آسانی سے مل جاتے ہیں۔ اسی طرح چرخے اور کھڈی کی جگہ سوت کاتنے اور کپڑا بننے کی مشینیں لگ گئی ہیں، رس کے کولہوؤں کی جگہ شکر بنانے والے ملیں لگ گئی ہیں جب معاشرہ میں تغیر و تبدل کا عمل شروع ہو تا ہے تو معاشرے کا پورا نظام بدل جاتا ہے لوگوں کے رہن سہن، عادات و اطوار، رسوم و رواج اور انداز فکر و احساس میں بھی رفتہ رفتہ انقلابات آنا شروع ہو جاتے ہیں۔

پرانے زرعی نظام میں زیادہ لوگ، زیادہ وقت دینے کے باوجود کم کام کر پاتے تھے لیکن اب جدید اور سائنسی دور میں کم لوگ کم وقت دیکر زیادہ کام کر لیتے ہیں۔ اس طرح دیہاتوں میں بھی لوگ کی کھپت کم ہوتی جا رہی ہے۔ قدیم طریقہ کاشتکاری میں زمیندار کو اپنی زمین کے لیے کھاد کے طور پر گوبر کو استعمال کرنا پڑتا تھا۔ اس طرح کئی کی ماہ وہ گوبر کو اکٹھا کرتا رہتا۔ تب جا کر وہ جمع شدہ گوبر کو اپنی زمینوں میں بکھیرتا۔ جدید دور میں کسان کو اپنی زمین کے لیے گوبر اکٹھی نہیں کرنی پڑتی بلکہ زمینوں میں گوبر کی بجائے مصنوعی کھاد اور کیڑے مار ادویات ڈال کر فصل کی مقدار کو کئی گناہ بڑھایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح زمین کو پانی سے سراب کرنے کے لیے دیہات کے لوگ مل کر کئی کئی گھنٹے ایک کھیت کو سیراب کرتے پھر جب دوسرے کسان کی زمین کو سیراب کرنے کی باری آتی تو پھر تمام کسان مل کر رہٹ سے پانی نکالتے اور دوسرے کسان کی زمین کو پانی مہیا کرتے لیکن آجکل کے سائنسی اور ٹیکنالوجی سے مزین دور میں ایک انجن اور ٹیوب ویل کے ذریعے تھوڑی دیر میں بہت سی زمینوں میں پانی پہنچایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح برصغیر میں ذرائع پیداوار کی طرح سماجی قدریں بھی بہت پرانی ہیں۔ جو آج پاکستانی معاشرہ میں موجود ہیں۔ اس قطعہ ارض پر ذات پات کا رواج بھی بہت قدیم ہے۔ لہٰذا اس مقالے میں ماضی کی دیہی معاشرت اور اس عہد میں بتدریج تبدیلیوں ں کا جائزہ پیش کرنے کی سعی کی جائے گی۔ برصغیر کی معاشرت پر اثر پذیر ہونے والے تہذیبی عناصر و عوامل کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ قدیم زمانے میں دیہات اور اہل دیہات اپنی جگہ ایک اکائی تھے۔ جنگوں اور شورشوں کے وقت دیہات عام طور پر محفوظ رہتے تھے۔ اس وقت اہل دیہات کا آپس میں مضبوط رشتہ ہوتا تھا۔ کیونکہ گاؤں کا کسان دوسرے لوگوں کا محتاج ہوتا تھا جو اسے کاشتکاری میں مدد باہم پہنچاتے تھے۔ اس طرح دیہات کا بیرونی علاقوں سے بہت کم رابطہ ہوتا اور ہر شخص کی ضرورت اسی کے گاؤں سے پوری ہو جاتی تھی۔ قدیم دیہات اپنی جگہ پر معاشرتی، تہذیبی، معاشی اور ثقافتی اکائیوں کے علمبردار ہوتے تھے۔ ان دیہاتوں کا رابطہ و تعلق دوسرے دیہاتوں اور علاقوں سے بہت بعد میں قائم ہوئے، کئی معاشرتی اور مذہبی وجوہات کی بنا پر یہ دیہات دوسرے دیہاتوں سے کٹے رہے اور ان دیہاتوں میں بسنے والے صرف اپنے دیہات تک ہی زندگی کی زلفوں کو سنوارتے رہے۔ ایک علاقہ دوسرے علاقے سے کافی دور ہوتا اور ایک دیہات سے دوسرے دیہات جانے کے لیے کافی وقت درکار ہوتا تھا۔ اس لیے اہل دیہات اپنے دیہاتوں کے ساتھ چمٹے رہے۔ ان کے آپس کے تعلق اور رابطہ کی عدم دلچسپی اس بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے گدھوں اور خچروں، گھوڑوں اور اونٹوں کو استعمال میں لاتے تھے کیونکہ اس وقت نقل و حمل کی جدید سہولتیں دستیاب نہ تھیں اور وہ دوسرے دیہااتوں سے الگ تھلگ اپنے شب و روز بسر کرتے رہے۔

اس طرح اگر کوئی معاشرہ قدیم اوزار و آلات کے استعمال پر اصرار کرتا ہے اور نئے آلات و اوزار قبول کرنے سے انکار کرتا ہے جو اس کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی حالت میں ہوتے ہیں تو تہذیب و معاشرت کی جڑیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔ سبط حسن آلات و اوزار کی اہمیت کی بابت لکھتے ہیں کہ

" دارائے ایران کو سکندر اعظم نے شکت نہیں دی تھی بلکہ ایک زوال پذیر معاشرت نے ایک ترقی پذیر معاشرے کے ہاتھوں زک اٹھائی تھی اور وادیٔ سندھ کی تہذیب پر آریہ اس وجہ سے غالب آئے تھے کہ ان میں توانائی مقدار، جس کا مظہر ان کے آلات تھے، یہاں کے قدیم باشندوں سے زیادہ تھی اور ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط اور پھر اٹھارہ سوستاون کے ہنگامے میں ہندوستانیوں کی شکست کے اسباب بھی اہل مغرب کے بہتر آلات و اوزار ترقی یافتہ معاشرتی نظام میں پوشیدہ ہیں۔“(34)(

برصغیر کے قدیم دیہاتوں کے الگ تھلگ اور ایک دوسرے کٹے رہنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی زراعت کے لیے تمام پیداواری ذرائع گاؤں ہی کے اندر سے دستیاب ہو جاتے تھے۔ بیل، ہل، درانتی، کھرپہ وغیرہ دیہات کے لوہار اور بڑھئی سے مل جاتے تھے۔ اس لیے کاشتکار کو اپنی زرعی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے دوسرے دیہاتوں یا شہروں کی طرف جانے کی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔

دیہات کے لوگ کھیتی باڑی کے کام میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے تھے کیونکہ کاشتکار زراعت کے مراحل سے اکیلا نہیں گزرتا تھا اس کے لیے اسے ہل، پھاوڑا، کھرپا، کدال، ہنسیا، درانتی، کسی وغیرہ کیلئے گاؤں کی بڑھئی اور لوہار کی خدمات حاصل کرنا پڑتیں تھیں۔ تیلی، تیل فراہم کرتا تھا۔ موچی جوتے اور چڑے وغیرہ کا کام کرتا، کمہار برتن وغیرہ بنا دیتا یا گھروں کی دیکھ بھال اور مرمت کا کام کرتا۔ کاشتکار ان تمام خدمات کا معاوضہ فصل تیار ہونے پر اناج کی شکل میں ادا کر دیتا۔ اس کے بعد جو جنس بچ جاتی وہ گاؤں کے مولوی صاحب، مراثی وغیرہ میں تقسیم کرتے کیونکہ گاؤں کی زندگی میں "مولوی اور مراثی" کا اہم مقام تھا۔ ان تمام معاوضوں کی ادائیگی کے بعد جو کچھ بچ جاتا وہ کاشت کار اپنے ہاں محفوظ کرلیتا تھا۔ جس سے وہ اپنی ضروریات زندگی پوری کرتا۔ دیہاتوں کی شہروں سے دُوری، نقل وحمل کی کمی اور راستوں کے غیر ہموار ہونے کی وجہ سے دیہات کی فصلیں منڈیوں تک نہ پہنچ سکتیں۔

برصغیر میں جب انگریزوں نے تاجروں کے روپ میں قدم جمانے شروع کیے تو نھیں اپنے اس منصوبے کا قوام برصغیر ہی میر صادق اور میر جعفر جیسے لوگوں سے ملنا شروع ہو گیا۔ مغل حکمران کی تن آسانی اور عیش کوشی نے انگریزوں کے خلاف کسی قسم کی مزاحمت کرنے کی حتی المقدور جسارت نہ کی اور آہستہ آہستہ یہ تاجر برصغیر پر قابض ہو گیا کیونکہ یہ خطہ بہت زیادہ زرخیز اور زرعی تھا اس لیے انہیں اپنے کارخانوں کے لیے خام مال اکٹھا کرنے کی سوجھی، گاؤں اور قصبات سے وہ زرعی اجناس خام شکل میں یورپ پہنچانے اور وہاں سے بنی بنائی چیزیں برصغیر میں بہت مہنگے داموں فروخت کرنے لگے۔ یہاں سے وہ کپاس، پٹ سن، گنا، تمباکو، چاول، گندم، پھل اور سبزیاں اپنے ملک کو بھیجتے تھے کیونکہ یہ زرعی اجناس دیہاتوں سے حاصل ہوتی تھیں اور شہروں اور دیہاتوں کا آپس میں رابطہ بہت کم تھا اس لیے انگریزوں نے دیہاتوں میں سڑکیں اور ریلوے لائینیں بچھائیں تاکہ خام مواد آسانی کے ساتھ دیہاتوں سے شہروں میں منتقل کیا جاسکے۔ اس طرح شہروں اور دیہاتوں کے روابط بڑھنے لگے۔ ان سڑکوں اور ریلوے نظام کی وجہ سے دور دراز کے علاقوں میں رسائی بہت آسان ہوگئی تو شہروں سے مذہبی اور سیاسی لوگ اہل دیہہ کو اپنا ہم خیال بنانے کے لیے دیہاتوں کے چکر لگاتے اس طرح دیہات کے لوگ شہروں کی خبروں سے واقف ہونے لگے۔

ہمارے معاشرے میں خاندان کے مل جل کر رہنے کی وجہ سے بڑے بوڑھوں کی بہت عزت کی جاتی ہے کیونکہ انہوں نے دنیا کو گھوم پھر کر دیکھا ہوتا ہو اور ان کا تجربہ وسیع ہوتا ہے۔ دیہی معاشرے کی سماجی قدریں شہر کی سماجی قدروں سے خاصی مختلف ہوتی ہیں سماجی قدروں سے مراد

" کسی معاشرے میں روابط وسلوک، اخلاق وعادات، طرز بودوماند، رسوم ورواج، حسن وجمال اور فن واظہار فن کے جو معیار رائج ہوتے ہیں وہی اس معاشرے کی سماجی قدریں کہلاتے ہیں۔"(35)

پاکستانی دیہاتوں میں غیر پیداواری قدریں بھی تقریباً مشترک ہوتی ہیں مثال کے طور پر مظلوموں کے ساتھ ہمدردی، فنکاروں کی عزت، بزرگوں کا احترام، استاد کا ادب، راست بازی، عدل، انصاف، مہمان نوازی، رحمدلی، خوشی اور شادی بیاہ کی محفلوں میں اپنی خوشی کا اظہار اور غم یا موت پر افسوس کرنا۔ یہ قدریں تقریباً تمام تہذیبوں میں رائج ہوتی ہیں لیکن ان کو برتنے کے انداز اور طریقہ ہائے کار الگ الگ ہیں۔ اس طرح بعض قدریں ہر دیہات اور معاشرہ کی الگ الگ ہوتی ہیں جو دوسرے علاقوں اور معاشروں سے اپنا

علیحدہ مقام اور مرتبہ رکھتی ہیں۔ مثلاً ایک دیہات میں گائے کو ذبح کیا جاتا ہے اور دوسرے دیہات میں اسی گائے کی پوجا کی جاتی ہے کچھ علاقوں میں سانپ، چھپکلی، مینڈک اور بچھوؤں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جبکہ بعض علاقوں میں ان ناموں سے بھی لوگ کراہٹ محسوس کرتے ہیں۔

ہمارے دیہاتی معاشرے میں عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں۔ کچھ عورتیں کھیتوں میں جا کر اپنے مردوں کے ساتھ فصلوں اور کھیتوں میں کام کرتی ہیں۔ بعض عورتیں گھروں میں بیٹھ کر گھر کے کام کاج اور کھانے پکانے میں مشغول رہتی ہیں۔ دیہاتوں میں عام طور پر پردے کا رواج بہت کم ہے البتہ گاؤں کے بڑے زمیندار، نمبر دار یا

چوہدری صاحب کی عورتیں پردے کی پابند ہوتی ہیں۔

دور دراز دیہاتوں مین دو یا تین دوکانیں جنرل اسٹور کے طور پر کام کرتی ہیں ان دوکانوں سے لوگوں کو اپنے استعمال کی ہر چیز میسر آ جاتی ہے۔ گاؤں کی دوکان سے لوگ اپنی ضروریات کی چیزیں گندم، چاول، کپاس یا کسی اور جنس کو دیکر خریدتے ہیں۔ اس کے علاوہ زراعت کے آلات و اوزار اور بیج، کھاد، روزمرہ زندگی کی تقریباً تمام اشیاء یہاں سے بآسانی حاصل کی جاسکتی ہیں۔ ادھار اشیاء حاصل کرنے کی عادت اب شہریوں کی طرح دیہاتون میں بھی سرایت کرتی جارہی ہے۔ بعض اوقات کوئی کسان اپنی کوئی قیمتی چیز زمین کو دوکاندار کے ہاں گروی رکھ دیتا ہے اور اس کے عوض دوکاندار سے اشیاء لیتا رہتا ہے جب کسان رقم واپس نہیں کرپاتا تو دوکاندار اس کی گروی شدہ چیز پر اپنے ہونے کی مہر ثبت کردیتا ہے۔ اس طرح کسان اور دوکاندار کے درمیان تلخ کلامی ہو جاتی ہے اور بات پنچائیت تک پہنچ جاتی ہے۔

پاکستانی دیہاتوں میں پنچائتوں کی بہت قدر کی جاتی ہے۔ پنچائت کا فیصلہ ہر دو فریق کو ماننا پڑتا ہے جو فریق پنچائیت کا فیصلہ ماننے سے انکار کرے اس فریق سے سارا گاؤں اپنا معاشرتی اور معاشی بائیکاٹ کر دیتا ہے۔ اس طرح مجبوراً چار و ناچار فریق کو پنچائیت کا فیصلہ ماننا پڑتا ہے۔ پنچائیت میں گاؤں کے بڑے بزرگوں اور نیک لوگوں کے علاوہ نمبر دار، زمیندار یا اس گاؤں کے وڈیرے یا چوہدری کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ پنچائیت کے اجتماع کی طرح گاؤں کے کسان چوپال میں بھی اکٹھے ہوتے ہیں۔ شام کے وقت اس چوپال میں گاؤں کے کسان باہم مشورے کرتے ہیں۔ روزمرہ کام کاج، بیج، فصل، جانور، بوائی، کٹائی، آبپاشی، گوبر کی سپلائی وغیرہ کے بارے میں ایک دوسرے کی تجاویز سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ عام طور پر گاؤں کی چوپال کسی وڈیرے کے ڈیرے پر ہوتی ہے جس میں کسان حقہ نوشی سے لطف اٹھاتے ہیں۔

قیام پاکستان کے وقت گاؤں ایک خود کفیل اکائی ہوتا تھا۔ لوگوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے گاؤں میں زراعت کے علاوہ دیگر پیشہ ور لوگ بھی موجود ہوتے تھے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر زراعت سے منسلک ہوتے تھے۔ ان لوگوں میں عہدے کے لحاظ سے نمبر دار، پٹواری، ڈاکیا اور امام مسجد وغیرہ ہوتے تھے جبکہ پیشہ کے لحاظ سے لوہار، کمہار، بڑھئی، نائی موچی، مراثی، جولاہا، تیلی، مصلی، حکیم، کمانگر اور کمی وغیرہ شامل تھے۔ یہ تمام لوگ کاشتکاری کے عمل میں کسان کی مدد کرتے تھے۔ گاؤں کا لوہار کاشتکاروں کے لیے درانتی، کھرپے، آری، ہل وغیرہ بناتا جس کے عوض اسے کسان سے جنس حاصل ہو جاتی۔ جس سے وہ اپنی ضرورت پوری کرتا۔ اسی طرح گاؤں کا کمہار کسانوں کے لیے برتن بناتا، گھروں کی تعمیر کرتا تھا۔

بڑھئی گاؤں والوں کے لیے لکڑی کا کام کرتا۔ ان کے لیے چارپائیاں اور بیٹھنے کے لیے "موڑھے" بناتا۔ نائی سارے گاؤں کے لوگوں کے بال تراشتا، دیہات میں شادیوں پر کھانے تیار کرتا اور لوگوں کے رشتے ناطے طے کرواتا۔ اس کے علاوہ وہ دیہات میں لوگوں کے پیغامات ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتا اور اپنا معاوضہ وصول کرتا۔ گاؤں کا موچی گاؤں والوں کے لیے قسم ہا قسم کے جوتے بناتا اور جوتوں کی مرمت کرتا۔ بعض اوقات نئے ڈیزائن کا جوتا بنا کر گاؤں کے وڈیرے کے پاس لے جاتا اور اس سے انعام حاصل کرتا۔ گاؤں میں گویئے کا کام عام طور پر مراثی سرانجام دیتا تھا۔ مراثی کی زندہ دلی اور بذلہ سنجی سے اہل دیہات کی خوشیوں میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ جولاہا اپنے ہنر سے

دیہاتوں کے لیے کھیس، دریاں، کمبل، آزار بند اور کپڑے بناتا، تیلی اپنے کوہلو پر مختلف اجناس سے تیل نکالتا، اور اس چیز کے لیے دیہاتیوں سے اپنی پسند کی چیزیں حاصل کرتا۔ مصلی گاؤں کی گلیوں اور نالیوں کی صفائی کرتے اور گاؤں کے بڑے زمیندار یا چوہدری کے ڈیرے پر جا کر چوہدری کے اشارے پر کام کرتے۔ اس کا حقہ گرم رکھتے اور ڈیرے وغیرہ کی صفائی کرتے۔ گاؤں میں جب کوئی شخص بیمار ہو جاتا تو اسے گاؤں کے حکیم صاحب کے پاس لے جایا جاتا۔ حکیم صاحب مریض کی نبض دیکھ کر اس کی تشخیص فرماتے اور اس کے لیے ادویات کی فراہمی کا باعث بنتے۔ کمانگر لوگ شکاری لوگوں کے لیے تیر کمان اور دیگر اوزار بنا دیتے جس سے دیہات کے لوگ اپنے شکار کو قابو کرتے اور انہیں خوراک اور لباس کے طور پر استعمال کرتے۔ کمی لوگوں کا کام عام طور پر مصلی سے ملتا جلتا ہے۔ کمی بھی مصلی کی طرح گاؤں کے ڈیرے پر کام کرتے ہیں یا وڈیرے کے جانور وغیرہ چروانے کے لیے لے جاتے ہیں اور ان مویشیوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ وڈیرا انہیں اس کے صلہ میں روزانہ دودھ یا رقم دیتا تھا۔ بعض اوقات مندرجہ بالا پیشے والوں کو نقد رقم نہیں ملتی بلکہ نئی فصل کے آنے تک انہیں انتظار کرنا پڑتا ہے اور فصل کے آچکنے کے بعد انہیں فصل سے حصہ یا رقم دی جاتی ہے۔

آج کے اس سائنسی دور میں جہاں دوسرے کاموں کے لیے مشینیں استعمال ہو رہی ہیں وہاں زراعت کے شعبہ میں مشینوں سے مدد لی جا رہی ہے اور فصل کے لیے زمین کی تیاری سے لے کر فصل کی کٹائی تک کے سارے عمل میں مشینوں کا سہارا لیا جا رہا ہے۔ زراعت کے شعبہ میں عام طور پر ٹریکٹر، ہل، تھریشر، ہارویسٹر کمبائن وغیرہ استعمال ہو رہی ہیں جہاں فصل کی بوائی سے لے کر کٹائی تک سو آدمی کام کرتے تھے اب مشینی دور کی وجہ سے وہاں تین سے پانچ آدمی کام کرتے ہیں۔ اسی طرح زمیندار اپنی اجناس کو سیپ کے طور پر دینے کی بجائے منڈیوں میں فروخت کرتے ہیں اس سے رقم حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح سائنسی دور کی وجہ سے کسان اور پیشہ ور پہلے کی نسبت اب آسودہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔

آریا لوگوں نے برصغیر میں ذات پات کو رواج دیا آریا لوگ اپنے آپ کو اعلیٰ و نسل تصور کرتے تھے، اور مفتوحہ علاقوں کے لوگوں کو کمتر خیال کرتے اور ان مفتوحہ علاقوں کے لوگوں کو صرف اپنی خدمات کے لیے منتخب کرتے۔ اسی لیے انہوں نے ہندو مذہب میں چار ذاتیں بنائیں اور ان کے فرائض بھی بیان کر دیتے۔ برہمن قوم کے روحانی راہنما تھے، کھشتری قوم کے نگہبان، ویش کا کام انتظامی امور کی دیکھ بھال اور شودر (جو ہندوستان کے مقامی باشندے تھے) ان ذاتوں کے خادم تھے۔ اسلام اگرچہ تمام انسانوں کو برابری کا درس دیتا ہے لیکن ہندوستانی معاشرے کے زیر اثر جو مسلم کلچر وجود میں آیا۔ اس میں طبقاتی اونچ نیچ موجود ہے۔

پاکستان شہروں کی نسبت دیہاتی علاقوں میں ذات برداری کا رجحان بہت زیادہ ہے۔ خاص طور پر دیہی علاقوں میں "الیکشن" کے موقع پر ذات اور برادریوں کا زمانہ بڑے عروج پر ہوتا ہے اور لوگ انہی برادریوں اور ذاتوں پر فخر کرتے ہیں۔ لوگوں کے بڑے بڑے اجتماعات اور نشست و برخاست ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ غم اور خوشی کے مواقع پر بھی دیہاتی لوگ اپنی اپنی برادریوں میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ دیہاتی معاشرے میں ذات اور برادری کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے۔ بعض ذاتیں نسل کی بنیاد پر مبنی ہوتی ہیں۔ جیسے پٹھان، سید وغیرہ بعض ذاتوں کے نام سکونت کی وجہ سے پڑ جاتے ہین جیسے کشمیری بلوچی وغیرہ دیہاتوں میں اکثر ذاتیں پیشوں کی بنیاد پر ہوتی ہیں۔ جیسے جولاہا (کپڑے بنانے والا) لوہار (لوہے کا کام کرنے والا)، نائی، (حجامت کرنے والے)، کمہار (مٹی کے برتن بنانے والا)، موچی (جوتیاں بنانے والا)، ترکھان (لکڑی کا کام کرنے والا)، تیلی (بیجوں کا تیل نکالنے ولا) وغیرہ وغیرہ۔

زرعی معاشرے کے حسی تجربے ان کے اظہار کے طریقے اور نظام فکر مختلف ہوتے ہیں۔ شہروں کی نسبت دیہاتی لوگ زیادہ ضعیف العتقاد ہوتے ہیں۔ زلزلہ، سیلاب، آندھی، طوفان، اولے، قحط اور وباؤں کو عذاب الٰہی سمجھنا، تقدیر پر ایمان رکھنا، جھاڑ پھونک، دعا، تعویذ، نذر و نیاز اور ٹوٹکے کی مدد سے اپنے بگڑے کام بنانے کی کوشش کرنا، مولویوں، پنڈتوں، پیروں، فقیروں کی خدمت کرنا اور درگاہوں اور مقبروں کی زیارت کو نجات کا وسیلہ سمجھنا اس زرعی نظام کی اعتقادی خصوصیات ہیں۔ دیہات میں مذہبی اقدار کی

پاسداری بھی کی جاتی ہے۔ دیہاتی لوگ مذہب کے نام پر مرمٹنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ پرانے وقتوں میں پورے گاؤں میں صرف ایک یا دو مساجد ہوا کرتی تھیں لیکن آج فرقہ پرستی کی بدولت ہر گاؤں میں ہر فرقے کی کئی کئی مساجد بنی ہوئی ہیں جو اکثر نمازیوں سے خالی رہتی ہیں لیکن مذہبی اجتماعات میں بھر جاتی ہیں۔ گاؤں کا جب ایک امام مسجد ہوتا تھا تو لوگ اسے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ گاؤں کا امام، بچہ کی پیدائش کی خوشی سے لے کر موت کے دکھ تک تمام مذہبی رسومات کی ادائیگی کا کام اپنے فرائض منصبی میں سمجھتا۔

ناخواندگی اور جہالت کی وجہ سے دیہات کے لوگ آج کی نسب پہلے وقتوں میں زیادہ ضعیف العتقاد ہوتے تھے۔ جس کی وجہ سے پیر پرستی، تعویذ گنڈے، جادو ٹونے اور بدشگونی کی برائیاں عام تھیں۔ اگرچہ کچھ فیصدی لوگ راسخ العقیدہ ہوتے تھے اور وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان رکھتے تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ ان میں قبر پرستی کی برائی بھی پائی جاتی تھی اور وہ بزرگوں کی قبروں پر جا کر اُنہی سے مشکلات کی آسانی اور اولاد وغیرہ کی دعائیں مانگتے تھے۔ یہ برائی پاکستانی معاشرے میں کافی حد تک موجود ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ برصغیر میں صدیوں سے ہندو اور مسلمان اکٹھے رہتے آرہے ہیں۔ اکٹھے رہنے کی وجہ سے ایک دوسرے کی خوشی اور غم کی رسومات میں شرکت ہوتی تھی اس لیے دوسری قوموں کی رسمیں مسلمانوں میں در آئیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا اپنے مضمون "پاکستانی کلچر" میں لکھتے ہیں۔

"مذہبی فضا میں مد دجزر اس طرح موجود ہے کہ فرد ایک لمحہ تو توحید اور آسمان کی باتیں کرتا ہے اور دوسرے ہی لمحے زمین سے چمٹا اوہام پرستی میں مبتلا دکھائی دیتا ہے۔ موخر الذکر رجحان کی جڑیں نہایت گہری ہیں اور اسے جنگل کی قدیم زندگی اور مذہب الارواح کے ان باقیات میں شمار کرنا چاہیے جو پورے برصغیر کے کلچر کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔"(36)

ماضی میں دیہاتیوں کے میل جول میں تکیے یا اس طرح کی دوسری جگہیں اہمیت کی حامل ہوتی تھیں۔ یہ تکیے عام طور پر گاؤں کی قبرستان یا کسی بزرگ کی قبر سے منسلک ہوتے تھے۔ تکیے کے ارد گرد بہت سے درخت ہوتے تھے۔ ان تکیوں پر ہر وقت دیہاتیوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ صبح کے وقت یہاں دیہاتی سیر اور ورزش یا مسواک لینے کے لیے آتے تھے۔ تکیے کے ساتھ ایک اکھاڑہ بھی بنایا جاتا تھا۔ جہاں گاؤں کے نوجوان صبح کے وقت پہلوانی کی مشق کرتے تھے۔ یہ تکیہ گاؤں کے بوڑھوں، بچوں اور جوانوں کی توجہ کا مرکز ہوتا تھا۔ گرمیوں کے دنوں میں کسان تپتی دھوپ سے بچنے اور آرام کرنے کے لیے انہیں تکیوں میں پناہ لیتے تھے۔ گاؤں کے اندرونی معاملات اور مسائل پر غور کرنے کے لیے پنچائیتیں اور سیاسی و سماجی اکٹھ بھی انہیں تکیوں میں منعقد ہوتے تھے۔

جدید دور میں جہاں بہت سی دوسری معاشرتی اقدار تبدیل ہو گئی ہیں وہاں یہ تکیے بھی دیہی معاشرت سے معدوم ہو گئے ہیں۔ ٹیلی ویژن کی سہولت گھر گھر پہنچ گئی ہے۔ جس کی وجہ سے دیہاتیوں کو گھر بیٹھے بٹھائے ہلکی پُھلکی تفریح فراہم ہو جاتی ہے اور جن علاقوں میں تفریح میسر نہیں ہے وہاں بھی تکیوں کا تصور ختم ہوتا جا رہا ہے۔ پاکستانی دیہات میں زیادہ تر رسومات بچے کی پیدائش اور شادی بیاہ کے مواقع پر ادا کی جاتی ہیں اس کے علاوہ کسی شخص کی وفات پر بھی کچھ رسومات ادا کی جاتی ہیں چونکہ پاکستان کے تمام علاقوں کا ماحول اور طبعی حالات ایک جیسے نہیں ہیں۔ اس لیے مختلف علاقوں کی رسومات میں بڑا فرق پایا جاتا ہے مگر چند اسلامی رسومات کی پاسداری تمام پاکستان کے لوگ کرتے ہیں جیسے بچے کی ولادت کے وقت گھٹی، ختنہ، عقیقہ یا غمی وغیرہ۔ اگرچہ اسلامی تعلیمات کے مطابق کسی عزیز کی وفات کا تین دن تک سوگ منایا جانا چاہیے لیکن لوگ مرنے والے کے لیے دوسرا، تیسرا، ساتواں، دسواں اور چالیسواں کا ختم دینا بہت ضروری خیال کرتے ہیں۔ خوشی اور غم کی بہت سی ہندوانہ رسومات پاکستانی دیہاتوں میں پائی جاتی ہیں جیسے بچے کی پیدائش پر گھر کے دروازے پر مختلف درختوں کے پتے باندھنا، گلے میں تعویذ ڈالنا، سیاہ کپڑا باندھنا یا گھر کی دیوار کے ساتھ جوتا لٹکا دینا۔ رسومات خوشی کی ہوں یا غم کی گاؤں کے امام کو ان تمام رسومات میں مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور مولوی صاحب کے لیے خورد و نوش اور نقدی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ خوشی یا غم کی رسم میں شمولیت ہر

دیہاتی کے ذمے لازمی ہوتی ہے۔ خاص کر شادی کے موقع پر کئی کئی دن دلہن کے گھر دیہات کی عورتیں گانے وغیرہ گاتی ہیں اسی طرح دولہا کے دوست اس کے اشارہ آبرو پر بھاگتے نظر آتے ہیں۔

دیہاتی لوگ صبح سے لیکر شام تک ایک طرح کا کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں۔ جب کوئی غیر معمولی واقع ہوتا ہے تو کسان لوگ اس میں بھرپور شرکت لازمی خیال کرتے ہیں۔ دیہاتی ذہن میلوں، ٹھیلوں کا بڑا شوقین ہوتا ہے۔ اس لیے ہر گاؤں میں سال میں اس طرح کی تقریب ضرور ہوتی ہے جہاں یہ میلے لگائے جاتے ہیں۔ وہاں عام طور پر کسی بزرگ کا مزار ہوتا ہے۔ ان میلوں میں لوگ دور دراز کے علاقوں سے آکر دوکانیں لگاتے ہیں جن پر گاؤں کے بچوں بوڑھوں اور جوانوں کے علاوہ عورتیں اور لڑکیاں خریداری کرتی ہیں۔ میلوں میں مختلف قسم کے دیہاتی کھیل جیسے کبڈی، کشتی، لٹھ بازی، دوڑ، رسہ کشی، مرغوں کی لڑائی، بٹیروں اور تیتروں کی لڑائی اور وزن کا اٹھانا وغیرہ میں حصہ لیتے ہیں اور اہلِ دیہات سے داد تحسین حاصل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض دیہاتوں میں زرعی میلے بھی منعقد ہوتے ہیں جن میں زرعی اجناس کھادیں اور طرح طرح کا سامان رکھا جاتا ہے اور کسانوں کو مفید اور مفت مشورے دیئے جاتے ہیں۔ کسان لوگ اس طرح کے اجتماعات سے بہت محظوظ ہوتے ہیں اور ان کے کام کرنے کی صلاحیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

دیہی علاقوں میں زمینداروں کے کردار کو بھی بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے تمام ناول نگاروں نے تقریباً جاگیرداروں کی خصوصیات ایک جیسی بتائی ہیں۔ یہ زمین کے ساتھ ساتھ اس پر محنت کرنے والے لوگوں کو بھی اپنی ملکیت سمجھتے ہیں اور ان لوگوں کے ساتھ غیر انسانی اور غیر اخلاقی سلوک کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اپنی زمینوں پر کام کرنے والوں کو اپنا بیل گھوڑا سمجھتے ہیں اور جنہیں وہ ایک وقت کا "چارہ" ڈالنا بھی پسند نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ یہ زمیندار عیاشی اور بے راہ رو ہوتے ہیں دوسروں کی عزت سے کھیلنا اور ان کی پگڑی اچھالنا ان کی فطرت ثانیہ ہوتی ہے۔ ان کے چہروں پر سرخی اور شان وشوکت غریبوں کا خون چوسنے کی بدولت ہوتی سے کھیلنا اور ان کی پگڑی اچھالنا ان کی فطرت ثانیہ ہوتی ہے۔ ان کے چہروں پر سرخی اور شان وشوکت غریبوں کا خون چوسنے کی بدولت ہوتی ہے۔

دیہی زندگی پر موسمی تغیرات اور طبعی حالات کو بڑا گہرا اثر ہوتا ہے اردو ناولوں میں دیہی معاشرت میں عورت کے مقام پر بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے، ہندوستان میں عورت صدیوں سے مرد کے ظلم کا نشانہ بنی ہوئی ہے اور آج کے زمانے میں بھی مردوں کا معاشرہ عورت کو اس کا مقام دیتے ہوئے ہچکچاتا ہے۔ اردو کے اکثر ناول نگاروں نے دیہی معاشرت میں عورت پر ہونے الے ظلم اور وت کے ساتھ ساتھ اس کے بدلتے ہوئے مقام کو پیش کیا ہے، اردو ناولوں میں دیہی علاقوں مین شاملات دیہہ اور تکیوں کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔ تکیوں کے موضوع پر ایک مکمل ناول غلام عباس نے "گوندنی والا تکیہ" کے نام سے تحریر کیا، جس میں انہوں نے تکیوں کے ماحول کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے تکیوں کے ختم ہونے کے اسباب اور اس کی وجہ سید یہی زندگی پر مرتب ہونے والے اثرات کو بھی پیش کیا ہے۔

"دیہی معاشرت میں پنچائیتیں ایک اہم سماجیاور سیاسی ادارے کی حیثیت رکھتی ہیں اس لیے دیہی معاشرت پر لکھے جانے والے بہت سے ناولوں میں ان پنچائتوں اور دیہاتیوں کی زندگی میں ان کے عمل دخل کو پیش کیا گیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان پنچایتوں کے ذریعے گاؤں کے چودھری، زمیندار اور ساہوکار غریب کسانوں کا معاشرتی اور معاشی استحصال کرتے ہیں، پنچائیتوں کے بعض فیصلے دیہی لوگوں کی بہتری کا باعث بنتے ہیں جیسے گوندنی والے تکیہ میں مہتاب بی بی کے رشتے کا جھگڑے کا فیصلہ یا ایک چادر میلی سی میں رانو اور اس کے بچوں کی کفالت اور تحفظ دینے کا فیصلہ وغیرہ۔ فضل کریم احمد فضلی نے جنگ عظیم دوم کی وجہ سے پیدا ہونے والے اثرات کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ فضلی نے جنگ کے دوران بنگال میں پیدا ہونے والے قحط سے دیہی لوگوں کی زندگیوں پر مرتب ہونے والے اثرات کو بیان کیا ہے۔ دیہی لوگوں کی زندگی میں مویشیوں کو بڑا مقام حاصل ہے، ماضی میں جب ہل پنجالی سے کاشت کاری کی جاتی تھی تو کاشت کاری کے عمل کا سارا انحصار بیلوں کی جوڑی پر ہوتا تھا اس لیے کسان کو

اپنے بیلوں کی جوڑی بڑی عزیز ہوتی تھی اور ویسے بھی زیادہ مویشی دیہی معاشرت میں عزت و وقار کا باعث سمجھے جاتے۔ قیام پاکستان کے بعد لکھے جانے والے ناول ایک چار میلی سی میں سکھوں کی دیہی معاشرت کو بھی پیش کیا گیا ہے، شہر ہوئے دیوانے، پندرہ اگست، رقص ابلیس، یا خدا وغیرہ بھی سکھوں کے ظلم و ستم اور دیہی حالات کو پیش کیا گیا ہے۔ امر تا پریتم نے پنجر میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ دیہی معاشرت پر ہونے والے مہاجن اور ساہوکار کے اثرات کو پیش کیا ہے۔

ہم نے قیام پاکستان کے بعد دیہی معاشرت کے خدوخال کو مناسب تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے تقریباً تمام پہلوؤں کی بھرپور عکاسی ہو جاتی ہے موضوع کی ابتداء میں ہم نے اردو زبان کے اثرات، دیہی ماحول، ثقافت کا اثر اور دیہی معاشرت کے خدوخال کو پیش کیا ہے دیہی زندگی میں تمام برائیاں تعلیم کی کمی کی وجہ سے ہیں ہمارے ملک میں تعلیمی فقدان کے ذمہ دار زمیندار، وڈیرے اور جاگیر دار اور سرمایہ دار لوگ ہیں، زمینداروں کو ہمیشہ یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اگر لوگ پڑھ لکھ گئے تو ان کے کھیتوں میں ہل کون چلائے گا۔ ان کی جاگیروں کی دیکھ بھال کون کرے گا ان کے ہزاروں ایکڑ پر محیط باغات کو پانی کون لگائے گا۔ ان کے بڑے بڑے کارخانوں میں کولہو کا بیل کون بنے گا۔ ان کے حقے کو تازہ کون کرے گا، ان کے گھریلو کام کاج کون کرے گا۔ ان کے لیے ڈرائیور، مالی اور باورچی کہاں سے ٹپکیں گے۔ ان وڈیروں کی نازک اندام بیگمات کے پاؤں دبانے کے لیے خادمیں کس کھیت میں اگیں گی، اس مراعات یافتہ طبقہ کو اندر ہی اندر یہ غم ستا تا رہتا ہے کہ اگر لوگ پڑھ لکھ گئے تو ان میں شعور پیدا ہو جائے گا۔ انہیں اپنے نفع نقصان کا ادراک حاصل ہو جائے گا ان کی سوچ غلامانہ ذہنیت کے اندھیروں سے نکل کر اپنے مفادات کی باتیں کرنا شروع کر دے گی۔

1947ء تا 1960ء کے عرصہ میں دیہی معاشرت جن تبدیلیوں سے دوچار رہی ان تبدیلیوں کا مکمل جائزہ پیش کر دیا گیا ہے۔ تاہم دیہی معاشرے کی خامیوں اور بے اعتدالیوں کے بارے میں بھی ہمدردانہ شعور اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارا ادیب دیہی ماحول کو پیش کرنے میں کوتاہی سے کام لے رہا ہے جبکہ زیادہ تر ادیب شہری حالات و واقعات کو اپنے ادب کی زینت بنائے ہوئے ہیں اگر وقت کے ادباء حضرات نے اس طرف توجہ نہ دی تو اردو ن ادب سے دیہی کلچر کی عکسی بالکل معدوم ہو جائے گی۔ تاہم یہ امید رکھی جا سکتی ہے کہ جب تک لہلہاتی کھیتیاں اور سرسبز باغات ہیں ادباء کرام ان کی طرف بھی توجہ کرتے رہیں گے اور دیہی ثقافت پروان چڑھتی رہے گی اور اردو ادب میں دیہاتی معاشرتی کی عکاسی ہوتی رہے گی۔

(حوالہ جات)

1 جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، نیشنل بک فاؤنڈیشن، لاہور، 1964ء، ص:64

2 سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، مکتبہ دانیال، کراچی، 1977ء، ص:392-393

3 وزیر آغا، ڈاکٹر، تنقید و احتساب، مکتبہ جدید، لاہور، 1968ء، ص:298

4 فیروز اللغات، اردو جدید، فیروز سنز، لاہور، ص:221

5 ایضاً، ص:239

6 فرہنگ عامرہ، محمد عبد اللہ خویشگی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1989ء، ص:176ء

7 ایضاً، ص:18

8 اُردو انسائیکلوپیڈیا، فیروز سنز، لاہور، 1984ء، ص:356

9 قومی انگریزی اُردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1992ء، ص:500

10 اردو لغت، تاریخی اصول پر، جلد پانزدہم، ترقی اردو بورڈ کراچی، 1993ء، ص:73

11 Encylopedia Americana, vol.8, USA,.315

12 Oxford Advanced Learner,s Encylopedic Dictionary, Oxford University Press, 1989, p.220

13 جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، ص:27

14 وزیر آغا، ڈاکٹر، تنقید و احتساب، ص308

15 جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، ص68

16 وزیر آغا، ڈاکٹر، تنقید و احتساب، ص298-299

17 سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، تہذیب و تخلیق، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1987ء، ص:71

18 ایضاً، ص71

19 سلیم احمد، ادیب اور مملکت (مضمون) مشمولہ روایت نمبر3، مکتبہ روایت لاہور، 1986ء، ص371

20 احمد ندیم قاسمی، تہذیب و فن، پاکستانی بکس اینڈ لیٹریری ساؤنڈز، لاہور، 1991ء، ص:92

21 محمد حسن عسکری، تخلیقی عمل اور اسلوب (مرتبہ) محمد سہیل عمر، نفیس اکیڈمی، کراچی 1989ء، ص61

22 سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، ص:401-402

23 عارف ثاقب، ڈاکٹر، بیسویں صدی کا ادبی طرز احساس، ص154-155

24 سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، ص58

25 سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، تہذیب و تخلیق، ص72

26 وزیر آغا، ڈاکٹر، تنقید اور احتساب، ص305

27 سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، ص10

28 عرش ملیسانی، بالمکند، مترجم، قدیم ہندستان کی ثقافت و تہذیب، تاریخی پس منظر میں، ازڈی ڈی کوسمبی، فینس بک ڈپو، لاہور، 199ء، ص23

29 عبدالحمید، دانی، تاریخ پاکستان، جلد اول، جامعہ کراچی، کراچی، 1967ء، ص29

30 وزیر آغا، ڈاکٹر، تنقید اور مجلسی تنقید، آئینہ ادب، لاہور، 1981ء، ص134

31 جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، ص180

32 رشید اختر، ندوی، ارض پاکستان کی تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، 1998ء، ص67

33 وزیر آغا، ڈاکٹر، دائرے اور لکیریں، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، 1986ء، ص:80

34 سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کے ارتقاء، ص33

35 ایضاً، ص:47

36 وزیر آغا، ڈاکٹر، تنقید اور مجلسی تنقید، ص192